

قرۃ العین حیدر

تار
سے
آگے

قرۃ العین
حیدر

افغانی

ستاروں سے آگے

قرۃ العین جید

ستاروں سے آگے

الادب

لاہور

حمد حقوق بچی ناشر محفوظ

پاکستان میں پہلی بار : ۱۹۷۹

ناشر : مڈل مصطفیٰ احمد

مطبع : مختیار پرنٹرز ، لاہور

مہزجیں کے نام

ترتیب

- دیوار کے درخت ، ۹
 پرداز کے بعد ، ۲۷
 سنا ہے عالم بالائیں کوئی کیسیا کرتھا ، ۵۱
 ٹوٹتے تارے ، ۸۱
 لیکن گومتی بہتی رہی ، ۸۹
 ستاروں سے آگے ، ۱۱۳
 آہ! اے دوست ، ۱۲۳
 این دفتر بے معنی..... ، ۱۳۳
 ہم لوگ ، ۱۵۱
 رقصِ شرر ، ۱۶۷
 یہ باتیں ، ۱۹۱
 اودھ کی شام ، ۱۹۷
 مونالسا ، ۲۰۷
 جہاں کارواں ٹھیرا تھا ، ۲۵۳

دیو دار کے درخت

نیلے پتھروں کے درمیان سے گزرتی ہوئی جنگلی نہر کے خاموش پانی پر تیرتے ہوئے دیو داروں کے سائے بیٹے دنوں کی باد کے دھندلکے میں کھوکھلے ٹٹے جا رہے ہیں۔ بھیلکی بھیلکی سرد ہوائیں پیڑھ کے نوکیلے پتوں میں سرسراتی ہوئی نکل جاتی ہیں اور دیو داروں کے جھنڈ کے پرے اس اونچی سی پہاڑی پر بسنی ہوئی سُرخ عمارت کی کھڑکیوں کے شیشوں پر چپا ند کی کرنیں پڑی جھلملاتی رہتی ہیں۔ لیکن کبھی بھول کر بھی۔ "We met in the Valley of Moon" والا محبوب گیت گانے کو دل نہیں چاہتا۔ ناشپاتی اور خربانی کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے سہ پہر کی چاء اب بھی ہوتی ہے گرامی کی نظر بچا کے کچی خربانیاں نہیں توڑی جاتیں۔ نیچے وادی میں رات کے فونجے والی ٹرین روز اسی طرح بل کھاتی ہوئی گزرتی ہے لیکن اس کی آواز نہ سننے ہی بے تحاشا بھاگتے ہوئے جا کر مسافروں کو شب بخیر کہنے یا روشنیاں گفنے کی اب قطعاً ضرورت محسوس نہیں ہوتی — یہ سب باتیں فضول اور پرانی ہو چکیں۔

ہمسائی بیڈم گورنیز کو دلا میں سے کبھی کبھی گتا رہا۔ Moon light in Havana لی بھول لی بسری آواز آ جاتی ہے تو دل جیسے چپکے سے ڈوب جانے کو تیار ہو جاتا ہے اور زرتیں بیانو بجاتے بجاتے تھک کر جمائیاں یعنی شروع کر دیتی ہے — خوشی

اور قہقہوں کے دن واقعی ختم ہو گئے۔ خالدہ، رباب، نرہیں — پتہ نہیں سب کو کیا ہو گیا ہے — دیو داروں کے درخت — میڈم اور سینزو کی سُرخ ناک — ان کی شاطو کے احاطے میں کھڑی ہوئی بغیر میٹوں کی فورڈ۔ باورچی خانے کے پیچھے سفید اور اودے پتھروں پر سے بہتا ہوا پہاڑی نالہ — یہ سب چیزیں اب بھی ویسی ہی موجود ہیں لیکن نہ جلنے کیسا سا لگتا ہے، جیسے ساری کائنات پر ایک تھکی ہوئی اُداسی ایک بیمار سا جمود طاری ہے۔

اس رات — باورچی خانے کی سُرخ ٹین کی چھت پر مہبت دیرنک بارش کے قطرے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔ جی چاہ رہا تھا کہ باتیں کریں مگر چپ چاپ، بظاہر منہایت انہماک سے ایک کونے میں صوفے پر اکڑوں بیٹھی، کراکائی Just Flesh پڑھتی تھی۔ رباب اس قدر تنہا ہی سے دوسرے کونے میں رکھے ہوئے بجلی کے چولہے پر اخروٹ کی ٹانی بنانے میں مصروف تھی گویا اس وقت اس سے زیادہ اہم کام دنیا میں اور کوئی نہ تھا۔ نرہیں صبح میڈم اور سینزو کے یہاں سے ایک نئی ٹیون سیکھ کر آئی تھی اور بار بار اسی کو بجائے جا رہی تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر آج برف پڑتی تو کتنا مزہ آتا!

اُم چاروں ایک دوسرے سے بیزار اور دوٹھے بیٹھے تھے۔ اتنے میں اڑوا اور چنار کی مٹہنیوں سے الجھتی ہوئی ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا اس زور سے کمرے میں داخل ہوا کہ سارے درجے پیٹ سے کھل گئے اور ہمارے جسموں میں سردی کی ایک کپکپاتی ہوئی لہر دوڑ گئی۔

دو ذرا اٹھ کر سامنے والا دروازہ تو بند کر لو جان۔“ خالدہ نے کتاب پر سے نظر اٹھائے بغیر مجھ سے کہا۔ ہم سب اپنے خیالوں میں اتنے کھوئے ہوئے تھے کہ ہوا کی

بدلتیزی پر واقعی غصہ آگیا۔

میں نے رباب کی طرف رخ کر کے بڑے پیار سے کہا: ”گڈو! تم تو دروازے کے اتنے قریب کھڑی ہو، ہاتھ بڑھا کر ذرا بند کر دو — میں یہاں سے اٹھ کے سارا کرہ عبور کروں، کس قدر طوالت ہو گی۔“

رباب نے بڑی بے نیازی سے مڑ کر دروازہ بند کیا اور بادام توڑنے میں مشغول ہو گئی۔ خالدہ نے کتاب کے ڈسٹ کو روتا کر پیر سے چڑھانا شروع کر دیا۔ زریں مسیقی کی کتاب کے ورق الٹ پلٹ کر نہ جانے کون سا گیت ڈھونڈھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بارش کی بوچھار سے درختوں کے شیشوں پر پانی گر کر نیچے پھسل رہا تھا۔ شیشوں کی جھلماٹا ہوتی سطح پانی کی اڑی سیدھی لکیروں سے دھندلی ہوتی جا رہی تھی اور اس دھندلے میں باہر کا منظر کچھ عجیب پھیلا پھیلا اور غمگین سا دکھائی دے رہا تھا۔ تپائی پر چھپیتال کی گتے بجلتے بجاتے خواہ مخواہ میرا دل چاہا کہ وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر ان شیشوں کو چھو لوں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے کیسے اچھے لگیں گے۔ بالکل اُلٹس کریم جیسے۔ برف کی طرح سفید اور نیلے یونیفارم اور اودے کمرے میں سے جھانکتے ہوئے ستارے۔ اسٹارز اینڈ اسٹریسیس — اخروٹ کی ٹافی — دھن دھن دھانکے ترکٹ تو ناکٹ نا — اودے شکر اور رام گوپال دھی نادھی، دھی نا — ریڈ کراس ویک منانے کے لیے رنک میں جو مانک پوری ناچ ہوا تھا کتنا اچھا تھا۔

نہتیں نے پیانو کے پردوں پر زور سے انگلیاں پٹک کر ایک بڑی رد مینٹک سی جمانی لی۔ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بوندوں کی ناگوار آواز اب مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ دو باتیں کرو گی؟“ رباب نے اطمینان سے انگلیوں پر لگا ہوا قوام چاٹ کر

بوجھا - An absolute trash خالدہ نے کتاب بند کر کے قالین پر پھینک دی۔
 ”رنک چلتی ہو پچھو!“ میں نے سوچا کہ ایسے پیارے موسم میں اگر جاوید کے ساتھ
 اسکیٹنگ یا آئس ہاکی کھیلی جائے تو بس جنت کا مزا آجائے۔
 ”میں بھلا کیسے چلوں گی۔“ خالدہ نے بڑے اسٹائل سے شال اپنے گرد لپیٹی اور
 سر پیچھے ڈال کر دھندلے شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔ سچاری کو ایک ہفتے سے ہلکا سا فلو
 ہو گیا تھا۔

”اُن بھلا کیسے چل سکتے ہیں۔ گرد یا خالدہ کیسے جائے گی۔“ نرین نے بے انتہا ہمدردی
 کے ساتھ کہا۔

”باتیں کریں۔“ رباب بولی۔ سب کا موڈ آہستہ آہستہ ٹھیک ہوتا جا رہا تھا۔ ”ہوہ
 پیوگی پیاری۔“ رباب لیڈی اردن کالج میں رہ کر بہترین قسم کی House wife بنی
 جا رہی تھی۔ جلدی کی ایک نظم گنگنا کر وہ ٹافی کو ٹھنڈا کرنے لگی۔

”میڈم کے بڑے لڑکے کو دیکھا جو کل ہی یہاں آیا ہے۔ کس قدر بے تکی سنہری سنہری
 مونچھیں ہیں اس کی۔“ نرین نے کہا۔ خالدہ بہت ہی بیمار انداز سے وکس سونگھے سونگھتے
 آنکھیں بند کر چکی تھی۔ مونچھوں کا ذکر ہوتے ہی تجھے خالدہ کا خیال آ گیا۔ بے انتہا اسٹائلش
 رائلڈ کالمین ٹائپ مونچھوں کا مالک۔ تو بہ۔ کیا واہیلٹ بات ہے۔

”ریڈ کراس ویک ختم ہونے والا ہے۔ ہم نے لیڈی مودی سے وعدہ کیا تھا کہ اتوار
 کے دن سے قبل کمبل تیار کر دیں گے۔“ میں نے گفتگو کا رخ جلدی سے دوسری طرف
 پھیر دیا۔

”اگر بارش یونہی ہوتی رہی تو کل جاوید بھی نہ آ سکے گا۔“ نرین بولی۔

”یہ جاوید کا اس وقت کیا ذکر تھا؟“ خالدہ نے فدا آنکھیں کھول کر پوچھا۔
 ”بابا ہی نے تجویز کی تھی کہ باتیں کی جائیں۔“ زریں بگڑ کر پیانو پر جھک گئی۔
 ”ان کمبلوں کے ساتھ کی عنابی اون ہی نہیں مل رہی۔“ میں نے صلح کرنی چاہی۔
 ”یہ جاوید کو کل خاص طور سے کیوں مدعو کیا گیا ہے۔“ خالدہ نے عنابی اون نہ
 لینے کی مطلق پروا نہ کرتے ہوئے پھر پوچھا۔ ہم چاروں میں وہ سب سے بڑی تھی۔
 اور امی کی عدم موجودگی میں ہمیں chaperon کرنے کا کام اس کے سپرد تھا۔
 ”کل ہیک مین میں وکٹری بال ہے۔ ہم اس کے ساتھ جائیں گے۔ تم مت جانا
 ڈیو۔ زکام بڑھ جائے گا۔“ زریں نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے زریں تاج بیگم امی اس چیز کو ہرگز پسند نہیں کریں گی۔ کیا تم
 میڈم کے ساتھ وکٹری بال میں نہیں جا سکتیں۔“ خالدہ وکس کی شیشی میز پر چٹخ کر
 اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میری پیاری سینوریٹا، غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ میں آپ سے صرف گیارہ مہینے
 چھوٹی ہوں۔ اور آپ مجھے ڈانٹنے کے کسی قانونی حق کی مالک نہیں۔ اور یہ کہ جاوید کی
 نیلی آنکھیں یا اس کے ساتھ آئس ماکے کے میج مجھ پر قطعی کوئی خطرناک اثر نہیں کر سکتے۔
 اور یہ بھی کہ جاوید نے جو تصویر بھیجی تھی وہ صرف آپ کے لیے مخصوص نہیں بلکہ ہم چاروں
 کے لیے تھی۔ اور اسے آپ اپنی خواب گاہ میں سجا کر بہت سمنٹ قانونی غلطی کی مرتکب ہو
 رہی ہیں۔ اور یہ کہ۔۔۔“ زریں کا جملہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ خالدہ تیزی سے شال پٹیتی
 اپنے کمرے کی طرف جا چکی تھی۔

اس رات سے دو ہفتے قبل مہمان کراؤن پرنس کھو گیا تھا۔ ہم چاروں اسے تلاش

کرتے ہوئے نالے کو پھلانگ کر نیلے پتھروں والی پہاڑی پر چڑھ گئے۔ پہاڑی پر بنی ہوئی سُرخی گول عمارت کے پیچھے ہو گھاس کا ڈھلوان قطعہ ہے اس کے آخری سرے پر کراؤن پرنس کی ہمتی ہوئی دُم کا سیاہ دھبہ نظر آگیا اور ہم سیٹیاں بجاتے اس کی طرف دوڑے — اور یہ بھی یاد نہ رہا کہ اس سرکاری لیسوریٹری کے احاطے میں، جہاں جنگ کے سلسلے میں ریسرچ اور جانے کیا کیا ہوتا ہے، بغیر اجازت داخل ہونے کی سخت ممانعت ہے۔ بھاگتے میں خالہ کے ہاتھ سے Dog's Biscuits کا ڈبہ کہیں گر گیا اور وہ تھک کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ ہم کراؤن پرنس کو بلاتے بلاتے پریشان ہو گئے لیکن نہ جانے وہ کہاں غائب ہو چکا تھا۔ زریں نے زور سے سیٹی بجائی۔ معلوم ہوا کہ جواب میں لان کے دوسرے حصے سے سیٹی بجا کر کتے کو کوئی اپنی طرف بلا رہا ہے۔ بارش ہو کر ابھی ٹکی ٹکی اور ہلکی سی گیلی گیلی دھوپ میں دیواروں کے سفید تنے اور نیلے پتھر تیزی سے چمک رہے تھے۔ زریں، نقاب اور میں بھیگی ہوئی ٹشمنڈی ٹشمنڈی گھاس اور نیلوفر کے پودوں کو روندتے ہوئے نیچے کی طرف بھاگے۔ اتنے میں دو در ڈھلوان کے دوسرے سرے پر سے دو سفید سے دھبے ہماری جانب بڑھتے نظر آئے۔ قریب پہنچ کر پتہ چلا کہ دو بہت خوبصورت آدمی ہیں جنہوں نے سفید ایمپرن باندھ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک کی آنکھیں نیلی سی تھیں۔ ہمارے پاس آکر وہ ڈک گئے۔ ابھی وہ دونوں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ مجھے ایک دم کچھ یاد آگیا اور میں نے سیاہ اسکارف میں بالوں کو پیٹتے ہوئے

پوچھا: "Are we trespassing?"

"اجی بالکل نہیں۔ آپ کے کتے کو بلا دوں۔" نیلی آنکھوں والے نے منہایت بے تکلفی سے کہا۔ پھر اس نے زور سے سیٹی بجائی اور کراؤن پرنس نہ جانے کدھر سے

جھاگتے ہوا آگیا۔

”میری جان کا ٹکڑا۔“ رباب نے جھک کر اسے اٹھایا۔

بچاؤ ارات بھریارٹش میں بھیننے کی وجہ سے بیمار ہو گیا تھا۔ ابھی میں نیلی آنکھوں والے کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے نرلبررت سے الفاظ سوچ رہی تھی کہ پیچھے سے خالہ کی آواز آئی: ”بچیو! اب واپس چلو۔ مالی کو بھیج کر ڈھونڈ والیں گے۔“

اور خالہ جب ہمارے پاس پہنچی تو یہ دیکھ کر یقیناً جل بھن کر رہ گئی کہ کس قدر رو مینٹلک جگہ پر، دیوداروں کے سائے میں جھکے جھکے بادلوں کے نیچے، دو بہت ہی زیادہ dashing قسم کے لڑکے ہم سے اپنا تعارف کر رہے ہیں۔ جاوید نیلی آنکھوں والا اور اجیت گھوش دوسرا۔ دونوں آئی۔ ایم۔ ایس میں تھے اور چنار ہی رولڈ ہوئے ان کا تبادلہ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ہوا تھا جہاں وہ ملیا اور چچھروں و چچھروں کی تحقیقات کر رہے تھے۔

دو کسی روز ہمارے یہاں تشریف لائے۔ ہم نہر کے اس پار سرخ چھت والی شاطو میں رہتے ہیں۔“ خالہ نے اسی کی قائم مقام کی حیثیت سے اُسے مدعو کیا۔ اور جب ہم گھر واپس آ رہے تھے تو زریں نے چپکے سے کان میں کہا: ”Perfect heat throbs.“ اور خالہ کو ٹھنڈ میں نکلنے کی وجہ سے زور سے چھینک آگئی۔

بارش پھر شروع ہو چکی تھی۔ اگلا دن ڈرائنگ روم کے دروازے بند کر کے آتش دان کے پاس کراؤن پرنس کا علاج کرانے میں گزرا۔ شام کو جاوید کراؤن پرنس کی مزاج پرسی کے لیے آیا اور ہم سب بہت دیر تک اس سے باتیں کرتے رہے۔ بچاؤ صبح سے شام تک لیباریٹری میں گھسا ریسرچ کیا کرتا تھا۔ چلتے وقت اس نے خالہ

سے کہا کہ وہ اس کے دکام کے لیے ایک بہت عمدہ دوا بھجوادے گا۔ پھر ایک دن اس نے ہم کو لیپور ریڑھی کی سیر کروائی اور ایک ایک چیز کی ماہیت، اثرات اور نہ معلوم کیا کیا الم غلم سب تفصیل سے سمجھاتا رہا۔ ہمیں بھلا اس میں کیا دلچسپی اور گھڑ مینچ کر میں نے زریں کو ڈانٹا کہ جب وہ بلوری آلات پر جھکا ہوا چھڑوں کی اقسام سمجھا رہا تھا تو وہ غور و بین پر نظر جانے کے بجائے اس کی نیلی آنکھوں کو مستحق کیوں دیکھتی رہی۔ زریں کرمے ویسٹ کے بہت سے لطیف یاد تھے اور اس نے حلوید کا نام mosquito bite producer رکھ چھوڑا تھا۔

”یہ گندے پن کی انتہا ہے زریں اگر اس نے اپنا یہ نام سن لیا تو کیا کہے گا؟“ میں نے ایک دفعہ سنجیدگی سے زریں سے کہا۔

”کہے گا کیا۔ ہمارے تخیل کی داد دے گا۔“ اور وہ شریر آنکھیں گھما کر ہنسنے لگی۔ تصویر کشی کے لیے دیوداروں کا جنگل اور اس کے نیچے پہاڑی بہترین پس منظر تھا۔ میں اکثر صبح صبح کراؤن پرنس کے ساتھ تصویریں بنانے کا سامان لے کر ان درختوں کے جھنڈ کی طرف چلی جایا کرتی تھی۔ ایک دن انہی پیڑوں کے نیچے میں لیڈی مودی کے لیے ایک تصویر تیار کر رہی تھی کہ پیچھے سے ہلکی سی سیٹی کی آواز آئی: ”ہلو! آرٹسٹ صاحبہ۔“ جاوید بہت لا ابالا نہ انداز سے پتلون کی جلیبوں میں ہاتھ ڈالے پیچھے سے کاغذ پر جھکا ہوا تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ”اوہ۔ ہلو کیٹن۔“ ہم کبھی کبھی دوستی کی موڈ میں اس کا نام لینے کے بجائے اسے ڈاکٹر، کیٹن یا کامریڈ کہا کرتے ہیں۔

”کو کیا ہو رہا ہے؟“

”کس قدر بیوقوف ہو، ظاہر ہے کہ تصویر بنانا ہی ہوں۔“
 دو اچھا شرط لگا لو کہ اس وقت تم تصویر بنانے کے علاوہ دل میں مجھے بھی یاد
 کر رہی تھیں۔“ وہ نہایت اطمینان سے قریب کے پتھر پر بیٹھ گیا۔
 ”واللہ! کیا کیا مغالطے ہیں! مولانا مجھے آپ کو یاد کرنے کی قطعی ضرورت
 نہیں۔“

”سچ کہہ رہی ہو!“ اس نے مجھے غور سے دیکھ کر کہا اور پھر زور سے ہنس
 پڑا۔ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے کاغذوں کو منتشر کر دیا اور میں جلدی سے انہیں
 چھنے لگی۔

”دنیاروز بروز نہ زیادہ خوبصورت اور خوش گوار ہوتی جا رہی ہے۔“ تھوڑی
 دیر بعد اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ اس روز ہم
 بہت دیر تک وہیں بیٹھے رہے۔ مجھے تصویر مکمل کوئی تھی۔ وہ پاس بیٹھا رنگوں
 کی آمیزش کے متعلق مشورے دیتا رہا۔

اسی طرح روز دیودار کے درختوں کے نیچے تصویریں بنانی جاتیں، باتیں
 ہوتیں، شام کے پروگرام بنتے، میرا اور چھپڑوں کا ذکر ہوتا۔ مجھے محسوس
 ہو رہا تھا کہ واقعی دنیا بہت پیاری اور خوبصورت بن گئی ہے۔ ایک دفعہ اس
 نے بچوں کی سی سادگی سے کہا: ”بے بی، اگر انہی درختوں کے سائے میں
 ساری عمر گزر جائے تو کیسا اچھا ہو۔“ اور میں اس کی خواہش پر زور سے ہنس
 پڑی تھی۔

دیوداروں کے نیچے وہ آخری دن تھا۔ خالدہ کے زکام نے بران کا ٹپس

کی شکل اختیار کر لی تھی اور اس وجہ سے میں اب بہت کم دہاں آتی تھی۔ خالہ میری بہترین دوست ہونے کے باوجود اب کچھ کھینچی کھینچی سی رہتی تھی۔ اور اس کا تجھے بے حد افسوس تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اسے کس طرح خوش کروں۔ جاوید اپنے مخصوص پتھر پر بیٹھا دور نیچے پہاڑی نالے کو ٹکلی باندھے دیکھ رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں کچھ عرصے سے وہ بہت خاموش رہنے لگا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے بچارے لڑکے کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ میں نے فکر مندی سے سوچا۔ میں اس وقت چپ چاپ رنگوں کے بُرش صاف کر رہی تھی۔

”خالہ اب کیسی ہیں؟“ اس نے یکجہت پوچھا۔

”آج تو اسے بخار نہیں آیا۔ شکر ہے۔“ میں نے جواب دیا، ”اسے دیکھنے کے لیے آتے نہیں ہو۔“

”میں نے کل اجیت کو بھیجا تھا۔“ وہ کچھ پریشان سا ہو گیا بھاری بھاری بادل چوٹیوں پر سے گزرتے ہوئے ہماری سمت آرہے تھے۔ میں نے کاغذ سمیٹنے شروع کر دیے۔

”اب اٹھنا چاہیے۔ بارش آرہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں اٹھو۔“ اس کی آواز میں اجنبیت سی آگئی تھی۔

”شام کو آنا۔ خالہ بھاری روزہ انتظار کرتی ہے۔ اچھا، پیر یو!“

”پیر یو۔“ وہ اٹھا اور گپکڑی ہڈی پر مڑ کر جھنڈ کی دوسری جانب نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کے بعد۔ خالہ دن میں کسی بار اسے فون کرتی اور وہ پیر اسی کے

ماخذ خالدہ کے لیے نئی نئی کتا بین بھجواتا رہتا۔ شام کو اس نے خالدہ کی مزاج پرسی کے لیے آنا شروع کر دیا۔ اور اس وقت وہ یہی چاہتی تھی کہ میں ، ندیں اور رباب اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہا کریں۔ وہ تمام دن اپنی خواب گاہ کے درجے میں شال میں لپیٹی پٹائی گرٹیا کی طرح بیٹھی جاوید کی بھیجی ہوئی کتا بین پڑھا کرتی تھی۔

اس شام۔۔۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھے بیٹھے تجھے بہت دیر ہو گئی۔ اس پاس کی پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر پھیلے ہوا کہرہ رات کی سیاہی میں گھل مل کر زیادہ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔ دور اونچی اونچی بر فانی چوٹیوں پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ مٹھوڑی دیر میں چاروں طرف پھیلے ہوئے مکانات اور عمارتوں میں ایک ایک کر کے روشنی ہو گئی اور جنگل کے پرے کا سارا منظر جگمگا اٹھا۔ دور انق کے نزدیک رنگ کی سبز روشنی کہرے میں جھللا رہی تھی۔ سردی محسوس ہو رہی تھی لیکن اندر جلنے کے بجائے غیر ارادی طور پر میرے قدم خالدہ کے کمرے کی طرف جانے والی روش پر اٹھ گئے۔ میں باورچی خانے کی انگوروں کی بیل سے ڈھکی ہوئی گیلری کی جانب بڑھ رہی تھی کہ درجے کے زردیشوں میں سے دو سلاٹ دکھائی دیے۔ خالدہ کہہ رہی تھی : ”امی کو تو آجائے دو۔“ آٹھ دس روزیں آجائیں گی۔“

”اس طرح کب تک ٹالتی رہو گی گرٹیا۔ اگلے ماہ تک شاید میرے تبادلے کا حکم آجائے گا۔“

”اے یہ ان گدھوں کی فطرت۔ میں جلدی سے گیلری میں داخل ہو گئی۔ اس

وقت مجھے خالہ پر دم آ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ خوب خوب روؤں اور نہ معلوم کیا کر ڈالوں۔

دوسرے دن صبح میں وہیں سیڑھیوں پر بیٹھی ریڈ کراس ویک کی نمائش کے لیے جنرل ٹنگمری کی نامکمل تصویر کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ آگیا: ”لو بے بی! کئی دن سے تمہیں نہیں دیکھا۔“ وہ پرانا دوستی کا انداز اور آواز میں شکستگی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بچی سیڑھی پر بیٹھ گیا اور پھر بولا: ”وکل مجھے بچاری خالہ کے پاس مہت دیز تک بیٹھنا پڑ گیا۔ تم تینوں اس کا دل بہلانے کی ذرا کوشش نہیں کرتیں۔ اس کی اعصابی کمزوری کو مسائیکالوجیکل علاج کی ضرورت ہے۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔ اس نے سگریٹ جلا لیا اور کانڈوں کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کی نیلی آنکھیں مجھے نہر لگ رہی تھیں۔

”میں منحل تو نہیں ہو رہا ہوں۔“

”بالکل نہیں۔“

”کیا بات ہے۔ مجھ سے ناراض ہو بے بی؟“

جیسے کئی پٹیوں میں آگ سی لگ گئی۔ ساری دنیا کو ایک زوردار ٹھوک لگا کر میں کہیں دور جھاگ جانا چاہتی تھی۔ چند لمحوں تک اپنی نیلی آنکھوں کی مقناطیسی کشش کی پوری طاقت کے ساتھ وہ مجھے دیکھتا رہا۔ میں برش تو میں پر ڈال کر اندر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ سگریٹ کی راکھ جھٹک کر وہ بھی کھڑا ہو گیا۔

”اچھا خدا حافظ۔ خالہ سے کہہ دینا کہ سہ پہر تک اگر میں خود نہ آ سکا تو

اجیت کے ہاتھ انجکشن کا سامان بھجوا دوں گا۔“

میں تصویر کو غور سے دیکھتی رہی۔ وہ پمپاٹک سے باہر جا چکا تھا۔ اس روز کے بعد سے وہ خود بچہ کبھی نہ آیا۔

دن گزرتے گئے۔ زریں سارا دن میڈیم لورینز کے ہاں رقص سیکھنے میں مشغول رہتی تھی۔ رباب کا کالج کھل گیا تھا اور وہ بھی جا چکی تھی۔ خالدہ روز بروز بیمار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ موسلا دھار بارشوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میں صبح سے شام تک خواب گاہ کے دروازے بند کیے آتشدان کے قریب خالدہ کے پاس بیٹھی رہتی تھی۔ گھریہ کوئی بڑا آدمی موجود نہ تھا۔ اجی اور ابا کسی ماہ کے لیے وطن گئے ہوئے تھے۔ دونوں بھائی محافظ پر تھے۔ ہماری تابلیق میڈیم لورینز کو اپنے بچوں سے ہی فرصت نہ ملتی تھی جو وہ سہارا دل بہلاتی۔ خالدہ کے متواتر فون کرنے پر جاوید نے کہہ دیا تھا کہ آجکل اسے دگنا کام کرنا پڑ رہا ہے۔ سر کھجانے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ کس قدر اُداس اور پریشان دن تھے۔

آخری رات — خالدہ کو تیز بخار ہو رہا تھا۔ باہر زور کی بارش شروع ہو گئی تھی۔ میں کمرے کے سارے دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے خالدہ کے صوفے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت ہی پیارے انداز میں اپنا سفید ہاتھ پیشانی پر رکھے آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس وقت اس کی بیماری آنکھوں کو دیکھ کر میں بہت ہی زیادہ فکر مند ہو گئی۔

”بے بی، پیاری! کیا تم مجھ سے بھی خفا ہو؟“ یکلخت آنکھیں کھول کر اس نے کہا۔ مجھے اس وقت بے اختیار اپنی گڑبادی سی خالدہ زاد بہن پر بے انتہا

پیار اور ترس آ گیا۔

”مجھے تم سے خفا ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ گڈ و!“ میں اس کی غلگلیں آنکھوں اور چھوٹے چھوٹے کمزور سفید ہاتھوں کو دیکھ کر اسے کب کا محاف کر چکی تھی۔

”سونے کی کوشش کرو جان۔ صبح تک بالکل اچھی سو جاؤ گی۔“ میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ اس نے کشتیوں میں منہ چھپا کر دیوار کی طرف کروٹ لے لی۔ باہر طوفان بڑھتا جا رہا تھا۔ نہ جانے کس خیال سے میں ایک دم بہت ہی گھبرا گئی اور جلدی سے دوسرے کمرے میں ڈیڑھ سیاحی کو بلانے کے لیے اجنبٹ تار لکھا اور بوڑھے حفیظ کو برساتی اڑھا کر پوسٹ آفس کی طرف باہر پانی میں دھکیں دیا۔ خالہ اسی طرح خاموش پڑی تھی۔ میز پر دو اکی ساری شیشیاں خالی پڑی تھیں۔ جاوید اپنے اسسٹنٹ گھوش کے ہاتھ دو ایلیں بھیج دیا کرتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت خالہ کو انجکشن کی ضرورت ہے۔ میں نے جلدی سے لیبوریری کا نمبر ملا کر جاوید کو فون کرنے کے لیے ریسور اٹھایا۔ دوسرے کمرے سے کوئی آواز نہ آئی۔ آندھی کی وجہ سے ٹیلیفون کے تار ٹوٹ چکے تھے۔

خالہ کی خواب گاہ کی مہم سبز روشنی کی طرف دیکھ کر میں نے اور کچھ نہیں سوچا اور سرعت سے گیلری میں جا کر برساتی پہنی اور چھتری لے کر باہر نکل گئی۔ تیز ہوا ایلیں کپڑوں کو مخالف سمت میں اڑائے لیے جا رہی تھیں۔ اندھیرے میں دیو داروں میں سے گزرتے ہوئے جھکڑ اور پانی کی بوجھاڑ کے شور سے دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگی اور بہت کر کے لیبوریری کی طرف بے انتہا تیزی سے بھاگنے لگی۔ چکنے پتھر پیروں کے نیچے سے پھسلے جا رہے تھے۔ دور

پہاڑی پر عمارت کی دھندلی روشنی چمک رہی تھی۔ نلے کے پل پر پہنچ کر وہ ہشت و خوف کے نامعلوم جذبے سے پیر آپ سے آپ رُک گئے لیکن خالدہ کا نہ د چہرہ آنکھوں کے آگے آگیا۔ میں نے تیزی سے پل کو عبور کیا اور پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ ہوا کے پتھیرے نیچے کو دھکیل رہے تھے۔ عمارت کی سفید چوڑی سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے میں جاوید کے دارالعمل کی طرف بڑھی۔ برآمدوں اور کمروں میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں نے شیشے پر دستک دی۔ جاوید دروازے کی طرف سے پشت کیے بلوری میز پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ دستک کی مدھم آواز طوفان کی گرج میں ڈوب کر رہ گئی۔ میں نے دوبارہ زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ جاوید نے پیچھے مڑ کر دیکھا: ”کون — ارے بے بی — تم — کیا — کیا بات ہے۔“

”جاوید — خالدہ —“ آواز میرے حلق میں اٹک گئی۔ وہ ششدر کھڑا تھا۔ میں نے اسے کچھ سوچنے کا موقع نہ دیا اور جلدی سے اس کا سینڈ بیگ اٹھا کر اس کا ماتحت پکڑ کر گھسیٹی ہوئی باہر آئی۔ ہم دونوں تیزی سے نیچے اترنے لگے۔ ”میری برساتی لے لو۔ میرے پاس چھتری کافی ہے۔“ اور میں نے اپنی برساتی اتار کر اس کے کندھوں پر ڈال دی۔ اس وقت وہ مجھے خالدہ کی وجہ سے عزیز معلوم ہو رہا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔ پہاڑ سے اترنے میں کئی دفعہ میرا پیر پٹے ریٹے بچا۔ اس نے مضبوطی سے میرا ماتحت تھام رکھا تھا۔ اس قدر سردی میں بھی اس کی ہتھیلیاں گرم ہو رہی تھیں۔ ہوا کے ایک پر شور پتھیرے نے مجھے اس کے اوپر دھکیل دیا۔ ”جاوید اور تیزی سے چلو۔“ میں نے سنبھل کر

اپنے پیر جہاتے ہوئے کہا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی تیر کی طرح خالہ کے پاس پہنچی۔ وہ اسی طرح کروٹ بیٹھ پڑی تھی۔ اس کی نبض کی رفتار اور بھی مدہم ہو چکی تھی۔ ”جان۔ جاوید آگیا۔“ میں نے اس پر جھک کر کہا۔ جاوید تو اب تک دوسرے کمرے میں کھڑا تھا۔ میں نے اسے خالہ کے کمرے میں دھکیل دیا، اور خود ڈرائنگ روم میں آ کر دیوان پر گر گئی۔ ”وہ یا اللہ میری مدد کر۔“ میں کشتوں میں مٹھ چھپا کر بہت دیر تک دعائیں مانگتی رہی۔

”بے بی پیاری کہاں گئیں؟“ برابر والے کمرے سے خالہ کی کمزور آواز آئی۔ ”ابھی آرہی ہوں گڑیا۔ تم دونوں کے لیے قہوہ بنا رہی تھی۔“ ”ہم دونوں کے لیے۔“ خالہ کے زرد چہرے پر سرخی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ جاوید میری طرف سے پشت کیے انجکشن کا سامان بند کر رہا تھا۔ ”خالہ پیاری، امی آتا رہے ہیں۔“

”واقعی؟ کب؟“ خالہ کا چہرہ جگمگا اٹھا اور جاوید نے ہینڈ بیگ سے سر اٹھا کر ایک لمحے کے لیے مجھے دیکھا۔ کاش اس کی اس وقت کی سفید رنگت اور پیشانی پر چمکتے ہوئے قطروں کو کسی طرح بھول سکتی!

اور طوفان کے بعد، دوسرے روز شام کو، ہر طرف دیواروں کے ٹوٹے ہوئے تنے بکھرے پڑے تھے۔ چنار کے مغرور درختوں نے سر جھکا لیا تھا اور رنگ برنگے سنگریزے بارش میں دھل کر شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔ میں برآمدے میں کھڑی حفیظہ کا انتظار کر رہی تھی جسے میں نے جاوید کو بلانے کے لیے بھیجا

تھا۔ امی اور بابا آپکے تھے اور خالدہ ایک بیمار ضدی بچے کی طرح ان کے پاس بیٹھی سنتی رہتی تھی۔ حفیظ کو بچپانے میں داخل ہوتے دیکھ کر میں دوڑ کر اس کے پاس پہنچی۔

”بے بی! بڑے ڈاکٹر صاحب تو صبح ہی چلے گئے۔“

”وہ کہاں؟“ میرا دل ڈوبنے لگا۔

”اجیت بابو نے سلام بولا ہے اور کہا ہے کہ بڑے صاحب نے اپنا تبادلہ

کر دیا تھا اور ایٹمی لیبریا یونٹ کے ساتھ لڑائی پر جانے سے پہلے ہی چھٹی لے چکے تھے۔ انجکشن کا سامان لے کر میں خود حاضر ہوتا ہوں۔“

— اور دیواروں کے سائے میں جس چھوٹے سے افسانے نے جنم لیا

تھا وہ ہمیشہ کے لیے ادھورا رہ گیا۔

پرواز کے بعد

جیسے کہیں خواب میں جہنجر ابرزہ یا ڈائنا ڈربن کی آواز میں ”سان فرینڈو ویلی“ کا نغمہ گایا جا رہا ہو اور پھر ایک دم سے آنکھ کھل جائے۔ یعنی وہ کچھ ایسا سا تھا جیسے مائیکل اینجلو نے ایک تصویر کو مکمل کرتے کرتے اگتا کر دیو نہیں چھوڑ دیا ہو اور خود کسی زیادہ دلچسپ موڈل کی طرف متوجہ ہو گیا ہو، لیکن پھر بھی اس کی سنجیدہ سی منسی کہہ رہی تھی کہ کبھی میں ایسا ہوں کہ دنیا کے سارے مصوّر اور سارے سنگتراش اپنی پوری کوششوں کے باوجود مجھ جیسا شاہکار نہیں بنا سکتے۔ پچھلے چپکے مسکرانے جاؤ بیوقوفو! شاید تمہیں بعد میں افسوس کرنا پڑے۔

اوسیفو — اوسائلی — اوسیلین — اے ہمارے نئے ریفریکٹر!

گرمی زیادہ ہوتی جا رہی تھی۔ پام کے پتوں پر جرمالی نے ادھر سے پانی گرایا تھا تو گرد کیس کیس سے دھل گئی تھی اور کہیں کہیں اسی طرح باقی تھی۔ اور مچھلیکی ہوئی رات کوشش کر رہی تھی کہ کچھ رو مینٹل سی بن جائے۔ وہ برقی لڑکے جو ہمیشہ سفید غرارے اور سفید دوپٹے میں اپنے آپ کو سب سے بلند اور الگ سا محسوس کروانے پر مجبور کرتی تھی بہت خاموشی سے ہیکلے کی ایک بیوی لگو کتاب ”پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ“ پڑھ رہی جا رہی

تھی جس کے ایک لفظ کا مطلب بھی اس کی سمجھ میں نہ ٹھنس سکا تھا۔
 وہ نیمپ کی سفید روشنی میں اتنی زرد اور غمگین نظر آ رہی تھی جیسے اس کے
 برگنڈی کیونکس کی ساری شیشیاں فرش پر گر کے ٹوٹ گئی ہوں یا اس کے فیڈ و کو
 سخت زکام ہو گیا ہو۔ اور لگ رہا تھا جیسے ایک چھوٹے سے گلیشیر پر آفتاب
 کی کرنیں بکھر رہی ہیں۔

چنانچہ اس دوسری آتشیں لڑکی نے، جو سینٹر بی۔ ایس۔ سی کی طالب علم
 ہونے کی وجہ سے زیادہ پوکھیلی تھی اور جو اس وقت برآمدے کے سبز جنگل پر بیٹھی
 گمے میں سے ایک شاخ توڑ کر اس کی کپاؤنڈ اور ڈبل کپاؤنڈ پتیوں کے مطالعے میں
 مصروف تھی، اس برفیلی لڑکی کو یہ رائے دی تھی کہ اگر گرجی زیادہ ہے تو پوائنٹ
 کاؤنٹر پوائنٹ پر ٹھننے کے بجائے سو جاؤ یا پھر نئے ریفریجریٹر میں ٹھنس کر بیٹھ
 جاؤ، اس کا اثر دماغ کے لیے مفید ہو گا کیونکہ اس میں رکھے ہوئے گرم گرم آم
 بالکل اولوں کی طرح سرد ہو جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ یہ تجویز قطعی ناقابلِ عمل تھی اور
 کوئی دوسرا مشورہ اس سائنس کے طالب علم کے ذہن میں اس وقت نہیں آ رہا تھا
 اس لیے وہ برفیلی لڑکی رنخندہ سلطانہ اسی طرح کپسے سے دماغ لڑا رہی۔ اور
 وہ آتشیں لڑکی شاہنہ بانو پر ہلا کر ایک گیت گانے لگی جو اس نے فرسٹ میڈرٹ
 میں سیکھا تھا اور جس کا مطلب تھا کہ جب شاہ جارج کے مہرخ لباس واپس پہنیں
 کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز بازگشت ہمارے پرانی اسکاچ پہاڑیوں کے سناٹے
 میں ڈوب جائے گی اور اپریل کے مہتاب کا طلائی بجز موسم بہار کے آسمانوں کی نیلی
 لہروں میں تیرتا ہوا تمہارے باورچی خانے کی چینی کے اوپر پہنچ جائے گا اس وقت

تم وادی کے نشیب میں میرے گھوڑے کے ہنہانے کی آواز سنو گی۔ اسے سرائے کے مالک کی سیواہ آنکھوں اور سرخ لبوں والی بیٹی !

لیکن رات خاصی گرم ہوتی جا رہی تھی اور ماہم کا ایک کونہ ، جو سمندر میں دور تک نکلا چلا گیا تھا ، اس پر ناریل کے جھنڈ کے پیچھے سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ اور دور ایک جزیرے پر بنے ہوئے پرانے کیتھڈرل میں گھنٹے کی گونج اور دعائے نیم شبی کی لہریں لڑناں تھیں۔ اور اس وقت مائیکل اینجلو کے ادھورے شاہکار جسم کو ایک بڑی عجیب سی ناقابل تشریح کوفت اور الجھن سی محسوس ہو رہی تھی جس کا تجزیہ وہ کسی طرح بھی نہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ وہ مطمئن تھا کہ ایسے حادثے وہاں تقریباً روز شام کو ہو جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ بیک تخت بہت پریشان سا ہو گیا تھا۔

کیونکہ آج دوپہر اس کو بہت تلخی سے یہ احساس ہوا تھا کہ وہ مغرور ، پھولے پھولے بالوں والی بریلی سی لڑکی ، جو ہر وقت اپنے مجسموں پر جھکی رہتی ہے ، اوروں سے کس قدر زیادہ مختلف ہے۔ جب اس نے اس چھوٹے سے قد والی لڑکی سے ، جس کی چھوٹی سی ناک پر بے اختیار سایہ آجاتا تھا اور جسے وہ محظوظی محظوظی دیر بعد احتیاط سے پاؤں کر لیتی تھی اور جس کی بڑے سے گھیر کی نذر ٹوپی پر گہرے سبز شٹل ٹھنیوں سے بندھے ہوئے چیری کے مصنوعی شگوفے سج رہے تھے ، سید اخلاق کے لہجے میں پوچھا تھا کہ میرے سامنے شام کا کھانا کھانے چلو گی تو اس نے جواب دیا تھا : ” ہاں چلو۔“ اور پھر وہ اس کے ساتھ ہلکے پھلکے قدموں سے زمین پر لڑنے لگی تھی۔ اور بس اسٹینڈ کی طرف بڑھتے

ہوئے اس چھوٹی ٹمسی لڑکی نے جس کی طرح کی لڑکیاں اپا لو بندر یا کنٹ پبلیس میں تیزی سے ادھر ادھر جاتی نظر آتی ہیں، اس سے پوچھا تھا: ”تم نے اسکول کب سے جوائن کیا ہے؟“

”ابھی ایک ٹرم بھی پوری نہیں ہوئی۔“ اور نام کیا ہے تمہارا؟“

”مگ — میگڈیلین ڈی کوڈرا۔“ اور تمہارا؟“

”جم۔ جمال۔ جمال النور۔ جو تم پسند کرو۔“

اور پھر وہ دونوں بس اسٹیشن کے سطح میں رل مل گئے تھے۔ اور ان کے جانے کے بعد برفیلی لڑکی اپنے پھولے پھولے بال پیچھے کو سمیٹ کر اپنے دن بھر کے کام کو غور سے دیکھتی ہوئی اپنی کار کے انتظار میں کلاس روم کی کھڑکی میں آکر کھڑی ہو گئی۔

اور وہ پیاری سی ناک والی مگ روزہ، شام کی طرح، خداوند خدا کی کنواری ماں کی تصویر کے آگے شمع روشن کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جسموں میں اگر احساس زندگی پیدا ہو جائے تو بڑی مصیبت ہوتی ہے۔ اور پھر کھیلنا سچ پر کون غور کرتا پھرے طوفانی لہروں کا ایک ریلہ جو ساحلوں سے ٹکراتا پھر رہا تھا سیاہ آنکھوں والے فن کار کی گرم سانسوں نے اس سرد اور بے روح محسوس میں جان ڈال دی تھی۔ گلیشیا کی طرح — لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ کاش کارل مسل ٹو کے نیچے اس سے کبھی نہ ملتا۔ بیگ، جس نے اپنی عمر ان سرد مجسموں کی معیت میں گزار دی تھی، جو اس کے چھوٹے سے قصبے کی خانقاہ کے مجبورے پتھروں والے اندھیرے مال اور دوسرے کمروں میں پھیلے پڑے تھے۔ برنسوں سے ایک ہی طرح سینٹ اگنس، سینٹ فرانس اور

سینٹ جارج — زندگی منجمد پتھروں کا ایک ڈھیر تھی اور پیدا ہونے کے جرم کی پاداش Ave Maria کی خوابیدہ موسیقی کی کتاب کا نیلہ ربن — پر بہت پرانی بات تھی یہ —

پھر اس کی آنکھیں نیوریلجیا کے شدید درد سے بند ہونے لگیں اور وہ اپنے نختے سے سفید پلنگ پر گر گئی — کارل اور اس کا گتار، کادل کی رابرٹ ٹانگر جیسے ناک جس پر ایک شام روشن ایرانی نے غصے میں آکر ایک مکہ رسید کیا تھا — روشن ایرانی اور اعظم مسعود اور آفتاب، جم کے وہ تین بوسہمیں قسم کے دوست جو دن بھر برٹش نیوز ایجنسی میں کام کرنے کے بعد شام کو پیانو بجا بجا کر شور مچا کرتے تھے — پھر گیٹ دے آف انڈیا کی محرابوں کے وہ اندھیرے سائے، وہ ہسپانوی سرینید —

کلاس میں وہ بریلی لڑکی ایک آدھ بار بے پردہ ہی سے نظر اٹھا کر اُسے دیکھتی اور پھر بڑی مصروفیت سے تجھے پر جھک کر اس کے پیر تراشنے لگتی اور مائیکل اینجلو کے شاہکار کے اودے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بکھر کے رہ جاتی — اور مئی کی بہت سی راتیں اسی طرح گزر گئیں —

بولیوار کے درختوں کے سائے میں، کھلے آسمان اور چمکتے ستاروں کے نیچے، موسم گرما کا جشن منانے والے رنشنہ کو وہ سارے پرنے گیت یاد دلائے دے رہے تھے جن کی طرزیوں کی سیٹیاں سنتے ہی اس کا دل ڈوب سا جاتا تھا — ٹارا لارا ٹارا لارا جون پیل — روزنامہ — گڈ نائٹ مائی لو — مریا ایلینا — چاندنی میں ڈوبے ہوئے سمندر ہی ریت کے ٹھنڈے ٹیلوں پر سے دوسرے

ساتھیوں کے گیتوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ ریت پر ٹپٹے ٹپٹے تھک کر رنشنڈہ کہنے لگی: ”برج ماما کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم سب ایک دوسرے کو غمگین بنائے بغیر زندگی گزار سکیں اور سادے کام ہمیشہ ٹھیک ٹھیک ہوا کریں۔ دُنیا کے یہ عقل مند لوگ —“

رات خاموش ہوتی جا رہی تھی۔ برج کو اس سے خیال آیا کہ اس نے ایک فلم میں، شاید ”بلٹے اینڈ سینڈ“ میں، ایک بچہ پیارا جملہ سنا تھا جو اس کو اب تک یاد تھا: “Madam, walking along in life with you has been a gracious time.”

رنشنڈہ اس کے ساتھ آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور ان کے قدموں کے نشان ریت پر ان کے پیچھے پیچھے بنتے جا رہے تھے اور بحیرہ عرب کی نیلی نیلی ٹھنڈی موجیں ان کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ رنشنڈہ رانی، چاند منس رہا ہے، تم بھی مسکرا دو —

اوہ انکل ٹوپی — تم اتنے اچھے سے ہو۔ میں سچ جج بے انتہا بیوقوف ہو گئی

ہوں۔

کیونکہ اس نے سنا تھا کہ اس کا ہونے والا منیجر بمبئی اسکول آؤ کنوکس سے ڈگری لینے کے بعد گھر واپس جانے کے بجائے یہاں صرف اس لیے رہتا ہے کیونکہ یہاں اس کی ایک کپ موجود ہے اور وہ ڈینک بھی کرتا ہے۔ اور موسم گرما کی چاندنی راتوں میں اپنے بوجھین دوستوں کے ساتھ اپنی سرخ گرجتی ہوئی کار میں درسا اور جو ہو کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا ہے — اور آتشیں لڑکی نے

چلا کر کہا تھا : اودہ تم کیسی پاگل ہو - اودہ خدا —

اودہ خدا — وہ کیسے دن تھے — وہ کیا زمانہ تھا - انیس بیس سے

لے کر چوبیس پچیس سال تک کی وہ عمریں — ذرا ذرا سی بات ، معمولی سے

واقعات ، جذبات کی لہریں ، بڑی زبردست ٹریجڈی یا کامیڈی یا میلو

ڈراما معلوم ہوتی تھیں - وہ چاروں دوست ایک دوسرے کے خیالات و افکار ،

دکھ سکھ اور محبتوں کے شریک - جینے کے آخر میں رومن رولینڈ یا شاکی تازہ

کتا بیس خریدنے کے لیے اپنے فاضلین پن بیچنے کو تیار - بگ کی حفاظت اور

عزت کی خاطر کارل کی دلکش ناک پر مکہ رسید کرنے کو مستعد - شام کو مادر

مقدس کی تصویر کے سامنے شمع جلانے کے بعد بگ ان کے لیے چاء تیار

کرتی - ان کے اور بہت سے دوست آتے اور وہ سب دیوان پر ، صوفے

پر ، قالینوں پر بیٹھ کر مہری تمباکو کا دھواں اڑاتے ہوئے جلنے کیا کیا باتیں کرتے

رہتے — لمبی لمبی بحثیں اور تنقیدیں جن کو وہ بالکل نہ سمجھ سکتی -

آسکروا ملٹ کی زندہ گی ، ڈی - ایچ - لارنس ، لیگی وزارتوں کی چیقلش ،

ریڈ مشا اور ریشیا ، بنگال ، خدا اور مذہب — اور اکثر وہ جوش بیس آکر

ایسی لمبی باتیں کہہ جاتے کہ وہ خوف سے لرز سکی اٹھتی اور مریم کی طرف عفو طلب

نگاہیں اٹھا دیتی - پھر کوئی چیز ان کی مرضی کے خلاف ہو جاتی تو وہ اسے ڈانٹ دیتے

تھے - جہینہ ختم ہونے سے بہت پہلے اگر پٹرول کے کوپن تمام ہو جاتے یا بار بار

ریٹیوٹنگ کرنے پر بھی کوئی تصویر درست نہ ہو سکتی یا فلیٹ کا کرایہ ادا کرنے سے

قبل ہی پنکوں اور سفینا کے ٹکٹوں پر سالار و پیہ ختم ہو جاتا تو وہ چاروں ذرا

اپنے آپ کو wrecks of life سمجھنے پر مستعد ہو جاتے اور یہ سوچ سوچ کر خوش ہوتے کہ وہ فن کار ہیں اس لیے زندگی کے ان زبردست مصائب میں گرفتار ہیں۔ اور نگ کو ان کے بچپن پر پیار آجاتا۔

— او میکڈلین — او موسم گل کے نیلے پرندو —

بیچرہ عرب سے اٹھنے والے بھاری بھاری بادل ۲۳ کا لچ لٹو، ٹانگا کے اس فلیٹ کی جانب اڑتے چلے آ رہے تھے جس کے نیچے ایک سیاہ بیوک آکر رکی۔ اور دینے ملے کرنے کے بعد دواڑے پر پہنچ کر کسی نے زور سے گھنٹی بجائی۔ اور چمکیلے پتھروں سے سبھی ہوئی دوشاندار خواتین اندر آ کر صوفے پر اس طرح بیٹھ گئیں گویا ایسا کرنے کا انہیں پورا پورا حق حاصل تھا۔ تین دوست گھبرا کر تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور پھر کمرے میں ایک عجیب حساس سی خاموشی طاری ہو گئی۔ کھڑکیوں کے باہر بادل آہستہ آہستہ گرج رہے تھے۔

”آپ جمال انور احمد کے دوست ہیں نا؟“ اس خاتون نے جس کے اونچے اونچے بالی ووڈ اسٹائل کے بال تھے، ساری کے آپنل کو بازو پر لپیٹتے ہوئے ہماری آواز میں پوچھا۔ وہی ڈرامہ شروع ہونے والا تھا جو ایسے موقعوں پر آج تک ہزاروں مرتبہ کھیلا جا چکا ہے۔

”وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ وہ یہاں رہتا ہے؟“ دوسری، زیادہ گرانبار خاتون نے سوال کیا۔ عورت — انہوں نے نگ کو ایک پیادہ سی، معصوم سی، رنگین تصویر کے سوائے اور کسی ذراویہ نظر سے کبھی دیکھا ہی نہیں تھا۔ عورت — اس کے لیے بڑا مہذب لفظ تھا یہ — وہ تو یاسمین کی کیلیوں کا

خواب بھی بس - وہ سوچنے لگے کہ ان شہزادیوں جیسی عالی شان خواتین سے کن الفاظ میں اور کس طریقے سے بات کریں - پہلی کم عمر خاتون نے یہ خیال کر کے کہ شاید یہ ہرنلسٹ اور فن کار ضرورت سے زیادہ حساس ہوتے ہیں ذرا نرمی سے پوچھا :

”میرا مطلب ہے کہ وہ خاتون کون ہیں اور یہاں کب سے...“ نگ کے لیے ”خاتون“ کا لفظ بھی بڑا عجیب سا معلوم ہوا - نگ تو بس نگ تھی - یا مہین کی ایک بڑی سی کھلی -

”آپ انہیں جانتے ہیں ؟“

”جی ہاں، مہبت اچھی طرح سے۔“

”معلوم ہوا ہے کہ ایک مس میگڈالین ڈی کوڈرا —“

”جی۔ جی ہاں درست بالکل — جی —“

وہ تینوں ایک دم پھر پریشان ہو گئے۔ ”معاف فرمائیے گایہ — یہ ہم کو نہیں معلوم۔“

”خوب — اور انہیں آپ اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“

”کیا یہ لڑکی کسی باعزت طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔“ دوسری خاتون نے

بزرگانہ بلندی سے کہا۔

باعزت طبقہ — نگ کے متعلق یہ ایک نیا انکشاف تھا جو پہلے ان کے دماغ

میں کبھی نہ آیا تھا۔ ان تینوں میں سے ایک چپکے سے دیوان پر سے اٹھ کر کھیلے

دروازے سے باہر نکل گیا اور باقی کے دونوں دل ہی دل میں اسے بددعا میں دینے لگے۔

”باعزت — ار — دیکھیے اس لفظ کو مختلف معنوں میں لیا جاسکتا ہے
— خصوصاً اس شہر کی سوسائٹی میں — یعنی کہ — ار —“

اعظم مسعود سینٹ زیویر میں لاجب کا بہت اچھا طالب علم رہ چکا تھا۔
دل میں اس نے کہا کہ کم بخت جم کا بچہ خود تو غائب ہو گیا اور ہم اس مصیبت میں
پھنس گئے۔ آنے دو گدھے کر۔

زینے کی طرف کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور وہ اندر آئی۔ اور اس نے
ان معزز مہانوں کو ایک لحظے کے لیے غور سے دیکھا۔ اور فرمائیچھے کہ ہٹ گئی۔
”آپ مس ڈی کوڈرا ہیں؟ میرا مطلب ہے — معاف کیجیے گا ہم آپ کے
گھر میں اس طرح بلا اجازت اور بغیر اطلاع آ گئے لیکن —“

”آؤ موزیل آپ غلطی پر ہیں۔ یہ میرا گھر نہیں ہے۔ میرے پاس فرسٹ فلور
پر صرف ایک کمرہ ہے۔ میں ان لوگوں کے لیے چاء اور کھانا تیار کرنے یہاں آئی ہوں۔“
اور ان دونوں اونچی خواتین نے اپنی بلندی پر سے جھک کر دیکھا کہ وہ
محض ایک سفید نام باورچین ہے — یعنی یہ بڑی بڑی آنکھوں والی بھولی سی
لڑکی — اسی کی طرح کی دوسری سفید نام یہودی اور انگیلو انڈین لڑکیوں
میں سے ایک — اُف — نفرت کی پوٹ۔

گفتگو بہت طول کھینچ رہی تھی۔ بڑی خاتون نے صوفے پر سے اٹھتے
ہوئے کہا :

”دیکھو لڑکی — کیا تم میرے لڑکے کو پسند کرتی ہو؟“ کیسا بیوقوفی کا
سوال تھا۔ اس نے سوچا، بھلا جم کو کون پسند نہیں کرے گا۔ اس نے اپنی

بڑی بڑی آنکھیں بے ساختگی سے اوپر اٹھا کر پوچھا : ”کیا جم خود آپ کو پسند نہیں ؟“

”اوہ — لیکن میری بچی جم تو خود میرا اپنا لڑکا ہے۔“ کمرے میں پھر وہی عجیب سا سکوت چھا گیا۔

”اور تجھے پتا چلا ہے کہ میرا لڑکا تم سے شادی کرنے کو بھی تیار ہے — جانتی ہو اس کے کیا معنی ہیں — اور اس کا نتیجہ کیا ہوگا ؟“

اوہ — او خدا — اب تو یہ سب کچھ برداشت سے قطعی باہر تھا۔ روشن ایرانی بلی کی طرح کشن ایک طرف پھینک کر دیوان پر سے کھڑا ہو گیا اور مگ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا جیسے قیمتی چمکیلے پتھروں میں سمجی ہوئی ساڑھے تین سوا اونچی اونچی باعزت خواتین چالوں طرف سے مگ پر حملہ کرنے والی تھیں۔ ہوا کے زور سے دروازوں کے پٹ بند ہو گئے۔ باہر بارش کے پہلے قطرے کھڑکی کے شیشوں سے ٹکرا رہے تھے۔

— تم خوبصورت تصویریں بنا کر ان میں رنگ بھر دو اور وہ ہمیشہ ان تصویروں کی اصلیت کا یقین کرتی رہے گی۔ تمہارا کام صرف یہی ہے کہ اس سے خوش نما، خوش گوشتار ستاروں کی باتیں کرتے رہو۔ اس کی ماں نے اسے بچپن میں بتایا تھا کہ شیطان کی اتنی لمبی دم ہے، اتنے بڑے سرخ کان ہیں، ایسے نوکیلے سینک ہیں۔ وہ بہت ہی بُرا ہے۔ اور دنیا جب بہت ہی بُری جگہ بن گئی تو ایک طوفان آیا۔ اور نوح، جو ایک بہت عمدہ انسان تھا، اپنے باعزت خاندان سمیت بچ رہا۔

اور پھر ابراہیم اور سلیمان اور داؤد اور موسیٰ — جو سب ایک سے ایک اچھے لوگ تھے — دنیا کو ٹھیک کرنے کے لیے آئے۔ خود خدا کو زمین پر آکر جھیل کی سطح پر چلنا پڑا — وہ ان سب باتوں پر یقین رکھتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چھوٹے بچے اپنے نرمی کے قصوں اور سپر ہیرو اور اسٹوڈنٹ کی کہانیوں کو سچ سمجھتے ہیں۔ لیکن بچے بڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے ہاتھ سے زیوتوں کی ڈالیاں اور للی کے پھول چھین کر انہیں چپکے سے کانٹوں کا تاج پہنا دیا جاتا ہے اور پھر ساری حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

تم اس سے وعدہ کرتے ہو کہ آج رات کو سارے چاند ستارے توڑ کر اس کے اگے ڈال دو گے۔ لیکن اسی رات کو اولمپس پر رہنے والے خداؤں کی بیویاں اس سے یہ وعدہ بھی چھین لیتی ہیں۔ اور تم ان ٹوٹے ہوئے چاند ستاروں کا سامنا نہیں کر سکتے — روشن بیٹے ذرا اپنے بلند و مقدس بیزداں کو ادا نہ دینا۔

اعظم مسعود نے تھک کر پاپ جلا لیا۔ اور وہ سب خاموش ہو گئے۔ وہ مصوّر تھے، انگریزی کے عمدہ جرنلسٹ تھے، معاشیات اور ادبیات، یلن ایم۔ اے کرچکے تھے، پولکا اور والز خوب کرتے تھے، اور سی۔ سی۔ آئی کے سوئمنگ ٹینک کے کنارے گھنٹوں پر پڑے رہا کرتے تھے۔ لیکن میکڈلین اپنا گتار سنبھال کر کارل کے ساتھ اپنی قسمت آزمائی کرنے کہیں اور، کسی دوسرے دیس کو چلی گئی اور وہ اسی طرح دیوار پر پڑے رومن دیوتاؤں کا مطالعہ کرتے رہے۔

ان دونوں نے میٹر میں نیچے اپنی کرسیوں پر بیٹھ کر مرحوم لیزلی ہاورڈ پر افسوس کرنا شروع ہی کیا تھا کہ بلا برکی نشست پر سے کسی نے پوچھا:

”مادام! یہ سیٹ ریزرو تو نہیں؟“

”جی نہیں۔“ رخشندہ نے ادھر دیکھے بغیر جواب دیا اور پھر برج کے ساتھ باقل میں مصروف ہو گئی۔ نووارد نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ جلاتے ہوئے پھر پوچھا: ”مادام! دھواں آپ کو ناگوار تو نہیں گزرے گا۔“

”جی نہیں۔“

اب کے سگریٹ لائٹر کی روشنی میں رخشندہ نے اس کی طرف نظر کی اور اسے لگا جیسے سارا میٹر وڈائنا میٹ سے اڑ کر دور فضاؤں میں لڑھکتا جا رہا ہے۔ اور برج لال کھڑے ہو کر ڈریس سرکل میں جانے کے لیے شاہندہ اور شیا ملا کا انتظار کرنے لگا۔ ”رشی رانی جلدی اٹھو۔“ جمع زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے گینگ وے کو پار کر کے زینے پر چڑھنے لگے۔ وہ شخص اپنی نشست پر بیٹھا دوسری طرف دیکھتا رہا۔ فلم شروع ہو چکا تھا۔ پردے پر برٹش مروی ٹون نیوز کی تصویریں کوندنے لگیں۔

دو ادھ برج ماما جلدی اوپر چڑھے۔ ”رخشندہ کی برقیلی پیشانی پر پانی کے ننھے منے قطرے نہ جانے کہاں سے آگئے۔ برج نے اس کا سفید ہاتھ پکڑ کر اسے سب سے اوپر سیڑھی پر کھینچ لیا اور وہ مجھے کے ریلے کے ساتھ ایک جھونک سے اس کے اوپر گرسی گئی۔ وہ اندھیرے میں شیا ملا اور شاہندہ کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اس نے اپنا ہاتھ آہستہ سے چھڑایا۔

Oh Gosh ! the gorgeous delicious thrill of it. وہ دیر تک اتنی سی بات کو سوچتی رہی۔ پھر اس کا جی چاہا کہ ایک زبردست زلزلے میں یہ سارا میٹر و ٹوٹ کر گر جائے اور برج اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر کہیں دُور بھاگ جائے۔ گرتے پہاڑوں اور ٹوٹی چٹانوں اور شور مچاتے ہوئے انسانوں سے بچا کو نیت دُور۔ اور پھر وہ — وہ دوسرا شخص — وہ مائیکل اینجلو کا شاہکار — نیچے بیٹھا تھا — چند منٹ قبل اس کے بہت نزدیک —

اور پھر دوسری رات کو آتشیں لڑکی نے اسے تاج میں دیکھا اور اس کا جی چاہا کہ ایک تیز آگ میں اسے جلا کر راکھ کر ڈالے، اس کی بکھری ہوئی مسکراہٹ کو، اس کے اُچھے اُچھے بالوں کو — وہ اس صوفے پر بیٹھ آئی تھی، اس گیلری میں سے گزری تھی، ان کشنوں کو چھو چکی تھی جن پر وہ اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی شاہیں گزار چکا تھا۔ جبکہ وہ دوسری برقی رشتہ خاموشی اور سکون سے بکسے اور بیرونی نکولس پڑھتی رہی تھی۔ ”مُس ڈی کوڈرا کیسی ہیں؟“ اس نے بوجھیا، حالانکہ اسے معلوم تھا کہ وہ جا چکی ہے۔

”اچھی ہیں۔ شکریہ!“ اس نے اسی سکون سے جواب دیا۔ ”آپ میرے ساتھ ایک راؤنڈ لیں گی؟“

”اُٹھئے۔“ اس نے کہا۔ کیونکہ وہ ہمیشہ بہت پریکٹیکل رہتی تھی۔ اور جمال کو تعجب ہوا کہ وہ آسانی سے اس کے ساتھ فلور پر کیسے آگئی۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ ریمبا کی موومنٹ کے ساتھ ساتھ آگ کے شعلوں میں گھوم

رہا ہے۔ اسے سرد چھینٹوں کی ضرورت تھی لیکن شعلے بہت اُونچے اٹھنے جا رہے تھے۔ رقص ہوتا رہا۔ کلارنٹ کا ایک نغمہ پوری تیزی سے بج رہا تھا۔ اس کی تھکی ہوئی نظریں خود بخود پلائی ووڈ کی ان دیواروں کی طرف اٹھ گئیں جن کے دروازوں پر گہرے سبز پمردے پڑے تھے اور جن کے سامنے فرن کی ڈالیاں برقی پنکھوں کی ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

سارے ریڈیو اسٹیشن اُدھی رات کا گجرجا چلے تھے۔ باغ کی پتیاں اور سمندر کی لہریں خوابستان کے جادو میں ڈوبتی جا رہی تھیں کسی نے بڑی پیاری آواز میں کہا: ”میں آسکتا ہوں؟“ وہ، جواب تک برآمدے میں آرام کر سی پرلیٹی ”پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ“ ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی، اپنا برف جیسا لباس سمیٹ کر جنگلے پر جھک گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے ذرا گھبرا کر برساتی کی طرف دیکھا۔

”اگر آپ کہیں گی تو میں ابھی ابھی فوراً واپس چلا جاؤں۔“ اس کا بات کرنے کا انداز بیحد دلکش تھا۔ وہ اور زیادہ پریشان ہو گئی۔

”ماہم سے باند رہ کا قریب ترین راستہ۔“

”جی نہیں۔ میں راستے کی تلاش میں آپ سے مدد کی درخواست نہیں کر رہا۔“

”تو کیا۔ کیا پٹرول ختم ہو گیا ہے؟“

”جی نہیں میرے پاس ڈھیروں گیلنوں پٹرول موجود ہے۔“

”پھر۔ پھر۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

”میں! کچھ بھی نہیں — میں سامنے سے گزر رہا تھا، آپ کو با دام کی شاخوں میں سے برآمدے میں بیٹھا دیکھا تو بس چلا آیا اندر — جاؤں واپس؟“

”اوہ گوش — آپ نے اتنی دور سے مجھے کیسے دیکھ لیا۔ مشاہدہ بہت تیز ہے۔“

”جی ہاں، مشاہدے کا میں ماہر ہوں۔ بہت عمدہ عادت ہے یہ۔ زندگی بہت دلچسپ ہو جاتی ہے اس سے۔ ایسی ایسی چیزیں نظر آ جاتی ہیں۔ اور اجازت دیجیے انگریزی میں کہوں کہ ہم ایسی چیزوں کی روح میں گھس سکتے ہیں جن کو دیکھنے کی بظاہر کوئی خاص ضرورت نہیں — سگریٹ پی لوں؟ شکریہ۔“

”نہ جانے آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔ خصوصاً جب کہ آپ مجھے قطعاً جانتے بھی نہیں۔ بہت دلچسپ اور عقل مند معلوم ہوتے ہیں آپ —“

”جی ہاں شکریہ۔ غالباً آپ پہلی خوبصورت لڑکی ہیں جس نے ایک خوبصورت لڑکے کے سامنے یہ اقرار کیا ہے۔ ورنہ عموماً مجھے آپ جیسی لڑکیوں سے یہ شکایت رہتی ہے کہ وہ اپنی عقل کے مقابلے میں کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔“

”بیٹھ جائیے، اس آرام کرسی پر — مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے بالکل اجنبی ہیں۔ اور اس وقت، اس گرم رات میں، با دام کی شاخوں کی سرسراہٹ کے نیچے اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے ہمیشہ سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں — ہیں نا؟“

”جی ہاں — بہت عجیب — دنیا میں بہت سی باتیں حد سے زیادہ عجیب

ہوتی ہیں جن کا بالکل آپ کو احساس نہیں ہوتا۔۔۔ ار۔۔۔ دیکھیے لڑکیوں
میں ہیر و درشپ کا مادہ ایک بڑی سخت کمزوری ہے۔۔۔“
”ہیر و درشپ؟“

”جی۔۔۔ اس وقت آپ مجھے بس چپکے چپکے ایڈ مارٹر کے جارہی ہیں
حالانکہ ابھی چند لمحے قبل جب آپ تصور میں جم کے ساتھ مسوری میں سیب
کے درختوں کے نیچے بیٹھی تھیں تو میرے دخل در معقولات پر آپ کو زوروں کا
غصہ آگیا تھا۔ ٹھیک ہے نا؟“
”سیب کے درخت؟“

”جی ہاں۔ سیب کے درخت!“
”مجھے یقین ہے کہ۔۔۔“

”جی۔۔۔ کہ رات گرم ہے اور چاند کے جادو کا اثر شاید مجھ پر بھی ہو گیا
ہے۔ اسی لیے میں اپنے بستر پر آرام کرنے کے بجائے ماہیم کی خاموش سڑکوں
پر مارے مارے پھر کر خوبصورت لڑکیوں کے بنگلوں میں گھس کے ان سے الٹی
الٹی باتیں کرنے کا عادی ہو گیا ہوں۔۔۔“
”اوہ گوش۔۔۔!“

”دیکھیے شاید آپ نے شمال کے برفانی کوہستانوں میں خوابیدہ کسی
کانوٹ میں اب تک اپنی عمر گزاری ہے۔ کم از کم آپ نے سینٹ زیویرز
میں تو کبھی نہیں پڑھا۔“
”آپ نے یہ کیسے اندازہ لگایا؟“

”کیونکہ آپ بات بات پر ادھ گوش کہہ کر خدا کی مدد چاہتی ہیں حالانکہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایسی خوش گوار رات میں خدا کو ہماری باتوں پر غور کرنے یا ان میں مداخلت کرنے کی قطعی ضرورت یا فرصت نہیں۔ اور یہ بھی کہ سینٹ زیویرز کی لڑکیاں زیادہ تیز اور صاف گو ہوتی ہیں — آپ جے۔

جے۔ اسکول میں ہیں نا؟“

وہ اسی طرح سگریٹ کے حلقے بنا کر کہتا رہا: ”دبچپ خیال ہے۔ سیب کے درختوں کے جھنڈ میں ملکہ کچھ راج کے ریکارڈنگ رہے ہوں یا کوئی درگا میں گا رہا ہو: سکھی موری روم جھم، سکھی موری دم — پسند ہے ورگا — دیوی بھیج دو رکا بموانی —“

”لیکن کم از کم مجھے اپنا نام تو بتا دیجیے۔“

”میرا نام — برج راج بہادر وارشنے — جمال انور — روشن ایرانی — جو چاہو سمجھ لو — ادھر دیکھو — میں تمہارا خواب ہوں اور تم چاندنی اور پھولوں کا گیت — پر مجھ میں اور ان لہروں میں، جو تمہارے برآمدے سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہیں، ایک چھوٹا سا فرق ہے۔ یہ دنیا سے بغاوت کرنا چاہتی ہیں اور کچھ نہیں کرتیں۔ میں دنیا سے بغاوت نہیں کرتا لیکن چاندنی رات میں تمہارے جنگل پر اکڑ بیٹھ جاتا ہوں۔ اور پھر یہ لہریں ساحل کو چھوڑ کر دور سمندر کی گہرائیوں میں جا کر کھو جاتی ہیں۔ سیب کے باغ میں چمکے سے خزاں گھس آتی ہے۔ با دام کی کلیاں اور سبز پتے خشک ہو کر پریشان ہو جاتے ہیں۔ اور ملکہ کچھ راج کے ریکارڈ اور تان پورے کے تار ٹوٹ جاتے ہیں ایک دن — اور آخر میں نیلے پروں والی چڑیاں

خزاں زدہ شاخوں پر سے اپنے پر پھیلا کر مہار کے تعاقب میں دو جنوب کے
 ہرے مرغزاروں کی جانب اڑ جاتی ہیں۔ جب خواب پچھلی رات کی چاندنی کی
 طرح پھیکے پڑنے لگتے ہیں اس وقت کی بے کیفی اور الجھن کا خیال کرو۔ سچ
 جج کی مسرت تم کہیں بھی نہیں پاسکتیں رخشندہ بانو۔ شاید تم سوچ رہی ہو
 کہ اگر میگدالین تمہیں مل جائے تو تم اپنی برفانی بلندی پر سے اس سے کہو:
 کارل ریو بن کے ساتھ کہیں بہت دور چلی جا اسے بے حقیقت لڑکی۔ اس
 کا گتار اور تیری آواز۔ یہی تیرا بہترین راستہ ہے۔ برج راج بہادر
 سے تم کہو: انکل ٹوٹی آپ میری دوست شیلا کے ایک خوبصورت اور
 ڈیشنگ سے ماموں ہیں جو اپنی سیاہ ڈی۔ کے۔ ڈبلو۔ خوب تیز چلاتے
 ہیں اور بس۔ آپ بھی تشریف لے جائیے۔ کیونکہ مسوری میں ہنی مون کے
 لیے سوائے میں ایک پورا سوٹ زندہ کرالیا گیا ہے جس کے پیچھے سیب
 کے درختوں کا جھنڈ۔“
 ”اوہ!“

”اب تمہیں نیند آ رہی ہے۔ اگر تم مجھے یاد کرو گی کہ تو میں پھر کسی ایسی
 ہی چاندنی رات میں الہ دین کے دیو کی طرح تمہارے خواب میں آ جاؤں گا۔
 شب بخیر رخشندہ سلطانیہ۔“

وہ اطمینان سے جنگلے پر سے کود کر باغ کے اندھیرے میں اتر گیا اور
 پھر اس کے قدموں کی چاپ سنان سڑک کی خاموشی میں کھو گئی۔
 ”مہربانی سے ادھر ہی رہیے آپ۔“

— اور جم کو بھو اب تک یہ سوچ رہا تھا۔ جانے کیا سوچ رہا تھا
 — جانے کیا سوچ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوا برف کے سارے
 پہاڑ اور ساری پٹنائیں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر پڑی ہیں اور ان کے بوجھ میں
 دب کر وہ بے تحاشا خوبصورتی اور نفاست سے سجا ہوا کمرہ نیچے گرتا چلا
 جا رہا ہے۔

وہ سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کرتی رہی
 اور وہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ وہ جو۔ وہ جو۔ او خدا — یہ
 مت سمجھو کہ میں fusses کر رہی ہوں۔ مجھے تم سے نفرت ہے۔ شدید نفرت! یا اللہ۔
 اسے تعجب ہو رہا تھا کہ اسے اب تک روزانہ کیوں نہ آیا۔ نہ معلوم اسے کیا ہو گیا
 تھا۔ میری بچاری بچی۔ مہنی مون ختم ہوتے ہی سائیکلو انالسٹ سے اس کا
 علاج کرواؤں گا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔

”اچھا کم از کم تم تو سو جاؤ۔ بہت تھک گئی ہو گی۔“

تھوڑی دیر بعد اس نے کہا اور وہ مخالفت کے بغیر ضدی بچے کی طرح
 مسہری پر گر گئی۔ وہ ٹہکتا رہا۔ اس رات اس نے سگرٹوں کا سارا ڈبہ ختم
 کر دیا۔

”کیوں میں منہ چھپا کر اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اس نے
 سنا جیسے کہیں بہت دور سے آواز آ رہی تھی۔ جم درتے میں کھڑا کہہ رہا تھا:
 ”اس کا انجام تم نے کیا سوچا ہے؟“

قانونی علیحدگی۔ اس نے اپنے آپ کو کہتے پایا۔ پھر وہ سو گئی۔ جیسے

اس نے دن بھر روتے روتے گزارا۔ اور بمباری یا زلزلے سے گری ہوئی عمارت کے بلے سے نکلے ہوئے کسی زخم خوردہ انسان کی طرح وہ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی برف جیسی پیشانی پر آگری تھی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ جھک کر اس لٹ کو وہاں سے ہٹا دے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا۔ یہ اس کی بیوی تھی، رخشندہ — خدایا۔ اور وہ خود جم تھا۔ جمال انور — مائیکل اینجلو کا شاہکار — اور بلند و بزرگ خدا، کیا ہم سب پاگل ہیں۔ خواب گاہ کا تیز لیمپ رخشندہ پر اپنی کرنیں پھینکتا رہا۔ اس نے سبز روشنی جلائے بغیر اپنے آپ کو صوفے پر ڈال دیا۔

پھر وہ چار دوست خاموشی سے زینے پر سے اتر کے اس کار کی سمت بڑھے جو گیٹ وے کے اندھیرے سائے میں کھڑی تھی۔ اس پاگل کردینے والی موسیقی کی گونج کیلر یوں، سٹالوں اور سمندری ہواؤں میں اب تک لرزاں تھی۔

مادام میگڈالین ریو بن جو فٹ لائٹ کی تیز کرنوں میں نہاتی ہوئی گام ہی تھی۔ اور کارل ریو بن جو پیا نو پر بیٹھا تھا اور مال جو الٹرا فیشن ایبل لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور — اور انہوں نے سنا کہ کارل ریو بن اور مادام ریو بن اپنے آرکیسٹرا کے ساتھ جہاں جاتے ہیں شہرت اور عزت ان کے قدموں پر جھک جاتی ہے۔ شمال کے سارے بڑے بڑے فیشن ایبل شہروں میں ان کے کونسرٹ ہو چکے ہیں۔ ریڈیو میں ان کے پروگرام رکھے جاتے ہیں۔ اتحادی فوجوں کو محفوظ کرنے کے لیے ان کو خاص طور سے مدعو کیا جاتا ہے۔ مادام ریو بن، جو سیاہ یا فقری شام کے لباس میں چمکیلے پتھروں سے سجی ہوئی، خاموشی سے

اپنے جیون ساتھی کے ہاتھ کا ہمارے کرایسٹج پر آتی ہے اور پھر ساری دنیا پاگل
 ہو جاتی ہے اس کے نعروں سے۔ اور انہیں تیزاب کی سی تلخی اور تیزی کے
 ساتھ یاد آیا۔ کارل کہا کرتا تھا: میرے ساتھ چلو مکہ میں تمہیں بلبلوں اور
 گولوں کی ملکہ بنا دوں گا۔ میگڈلین — میگڈلین — میری سینوریتا۔ گوا کی
 کالی راتیں تمہیں پکار کر واپس بلا رہی ہیں۔ راتوں کو تمہارے بالوں میں ستارے
 سجائے گئے اور حنّاب کے معنی کا گتا رہ جتا رہے گا۔ تم — مک — سُرخ
 ہونٹوں والی چوہیا — تمہاری نیوریجیا کی شکایت ہمیشہ کے لیے دوسرے ہو جائے
 گی۔ تم میری آنکھوں سے دیکھو گی، میرے کانوں سے سنو گی، میرے جادو سے
 رقص کر دو گی اور ساری کائنات مہر موش ہو کر ہمارے ساتھ ناچنے لگے گی۔ بیوقوف
 لڑکی جو ان چار سر پھرے ہندوستانی لڑکوں کے لیے کرافار کیٹ سے جھپلی کے
 ڈبے خرید کر لاتی ہو اور ان کی چائے کی پیالیاں صاف کرتی ہو۔ ربّ یہودہ کی
 قسم اس بھورے بالوں والی گلہری میں ذرا بھی عقل نہیں!

پھر انہوں نے سنا اتحادی فوجوں کو محفوظ کرنے والی ایک پارٹی کے ہمراہ
 مشرق وسطیٰ جاتے ہوئے جہاز پر ایک حادثے کی وجہ سے مسٹر کارل ریوبن کا
 انتقال ہو گیا اور غریبورت اور غمگین مادام ریوبن پارٹی سے علیحدہ ہو کر اپنے
 وطن واپس چلی گئیں۔

اور ایک نیلگوں صبح گوا کے ایک چھوٹے سے ہرے بھرے قصبے کے پرانے
 اور بھورے پتھروں والے کیٹھیڈرل میں جب ماس ختم ہونے کے بعد فادر
 فرانسکو نے قربان گاہ کے درپے کے سامنے کا پردہ برابر کیا تو ان کی پیشانی

پیر اور بڑی بڑی نیلی آنکھوں میں ایک ملکوٹی مسرت اور اطمینان کی روشنی
چمک رہی تھی۔ کیونکہ ایک بمشکی ہوئی روح آخر اپنے چرواہے کے پاس
پہنچ چکی تھی۔ ”خداوند خدا کی رحمت ہو اس پر، وہ یسوع کی دامن بن
گئی۔“ دعا کے آخری الفاظ بھورے پتھروں والے ہال کے مجھڑ سنڈے میں
دوب گئے اور فادر ڈائیگو آرگن بند کر کے سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔
باہر آسمان کے نیچے بہت سے ٹوٹے ہوئے نیلے پر ہوا میں تیرتے پھر رہے
تھے۔

اور ایسی ہی ایک نیلگوں شام کے اندھیرے میں، جب کہ تاج کی ایک
گالانائٹ کے اختتام پر گیٹ وے، برساتی اور گیلیریوں میں جمع کم ہوتا جا
رہا تھا، موٹر میں اسٹارٹ ہو چکی تھیں اور اکا دکا لوگ سیڑھیوں اور سڑک کے
کنارے سگریٹ جلائے اور اپنے دوستوں کو شب بخیر کہنے کے لیے رُکے ہوئے تھے۔
ان چارہ دوستوں نے اپنے پائپوں کی لاکھ جھلکی اور ان کی سرخ کار ڈھلوان پر
بہنے لگی۔ رات گرم تھی اور درسا اور جوہو کی عیبیہ دار سڑکیں ان کا انتظار
کر رہی تھیں۔

1-11-1918

603918

سُنا ہے عالمِ بالا میں کوئی کیمیا گر تھا

پھر شام کا اندھیرا چھا گیا ۔

کسی دور دراز کی سرزمین سے ، نہ جانے کہاں سے میرے کانوں میں ایک

دلی ہوئی سس ، پھپھی ہوئی اواز آہستہ آہستہ گارہی تھی :

چمک تارے سے مانگی ، چاند سے داغِ جگر مانگا

اڑائی تیر کی تھوڑی سی شب کی زلفِ برہم سے

قرطبہ کی پائی ، حور سے پاکیزہ کی پائی

حرارت لی نفسہائے مسیح ابنِ مریم سے

ذرا اسی پھر لبوبیت سے شانِ بے نیاز می ل

ملک سے عاجزی ، افتادگی تقدیرِ شبنم سے

خوامِ ناز پالیا آفتابوں نے ، ستاروں نے

چٹک غنیمتوں نے پائی ، داغِ پلٹے لالہ زاروں نے

کوئی وائٹن کے مدھم مدھروں پہ یہ گیت گاتا رہا اور پھر بہت سی آوازیں پیاپی

سی ، جانی بوجھی سی دور پہاڑوں پر سے اترتی ، بادلوں میں سے گزرتی ، چاند کی

کرنوں پر ناجی ہوئی بالکل میرے نزدیک آگئیں۔ میرے آس پاس پرانے نغمے
 بکھیرنے لگیں۔ میں چپ چاپ خاموش پڑی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں
 چاہیں۔ میں نے سنا، والٹن کے تار لرز اٹھتے۔ اور پھر ٹوٹ گئے۔

”امینہ آیا!“ ”ہوں۔“

”امینہ آیا، السلام علیکم۔“ ”وعلیکم۔“

”امینہ آیا، ایک بات سنئے۔“

”کیا ہے بھی؟“

”اؤہ، بھی امینہ آیا آپ توفٹ ہی نہیں دیتیں۔“

”ارے بھی کیا کروں تمہارا۔“

”ہائیں کیجیے، ٹوٹی کھائیے۔“

”ہم۔“

”امینہ آیا، ہوائی جہاز میں بیٹھے گا؟“

”خدا کے لیے آصف میری جان پر رحم کرو۔“

”امینہ آیا واقعی اتنا بہترین فلائنگ فورٹس آپ کے لیے کیفیٹا سے

لایا ہوں۔“

”آصف۔۔۔ ال۔۔۔ لو۔۔۔“ یہ میری آواز تھی۔

امینہ آیا انتہائی بیزار رہی اور فلسفے کے عالم میں صوفے پر اکڑوں بیٹھی

”ہندوستان کا غذائی بحران“ پڑھنے میں مشغول تھیں۔

آصف نے مظلومیت کے ساتھ مجھے دیکھا۔

”چلو۔ مکینو سے تمہارا فلائنگ فورٹرس بنائیں گے۔ میرا پیارا بچہ۔“
 پھر ہم اندھیرا پڑنے تک ڈرائنگ روم کے درتچے میں بیٹھے مکینو سے
 طیاروں کے ماڈل بناتے رہے۔

”امینہ آپا اب تک ایسی ہی ہیں۔“

”تو کیا تمہارے داغِ مفارقت دے جانے کے غم میں تبدیل ہو جاتیں؟“
 ”بہت اونچی جاتی ہیں بھئی۔ ہندوستان کا غذائی بحران۔ وہ کیا ہوتا
 ہے شاہ رخ؟“

”ڈریش اٹ۔ مجھے نہیں معلوم۔ اللہ، کون عظیم الشان چغندر ان سے
 شادی کرے گا؟“

”فہ۔ بہترین امریکی سگریٹ ہیں۔ پیو گی؟“

”چپ۔ امینہ آپا نے دیکھ لیا تو کان پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیں گی۔“
 ”بلو۔“

پھر یہ آوازیں بھبکی رات کی ہواؤں کے ساتھ ناچتی ہوئی بہت دور ہو گئیں۔
 میں نے سونے کی کوشش کی۔ میری آنکھوں کے آگے خواب کا دھندلا چھیلتا
 چلا گیا۔

سرو کے درختوں کے پیچھے سے چاند آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ وہ
 بالکل معمولی اور ہمیشہ کی سی ذرا سنہری رات تھی۔ ہم اسی روز ۱۸۔ وارث روڈ
 سے شفٹ کر کے اس لین والی کوکھی میں آئے تھے۔ اس رات ہم اپنے کمرے
 سبجانے اور سامان ٹھیک کرنے کے بعد تھک اور اکتا کر کھانے کے اشتہار میں

ڈرائنگ روم کے فرش پر لوٹ لگا رہے تھے۔ عثمان ایک نیاریکا ریڈنریڈ کر لایا تھا اور اسے پچیسویں مرتبہ بجا رہا تھا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ وہ ملکہ بکھراج کاریکا ڈوٹھا: ”جاگیں تمام رات، جگاٹیں تمام رات۔“ ملکہ بکھراج کی آواز میرے ہم مہین بھائیوں کی قوم بالاتفاق مرتی تھی۔ عثمان جہا ہیاں لے رہا تھا۔ صبیحہ کچھ پڑھ رہی تھی اور میں کشنوں پر کہنیاں ٹیکے اور پیر اوپر کو اٹھائے قالین پر لیٹی لیٹی بوری ہو رہی تھی۔ اور اس وقت سامنے کے برآمدے کے اندھیرے میں کچھ اجنبی سے لوٹوں کی چاپ سنائی دی اور ایک ہلکی سی سیٹی بجی۔ ”ہلو۔ کوئی ہے۔“ اور جیسے سمندر کی موجوں کے ترنم کے ساتھ ریوڈی کوٹن کے آرکیٹر کی ڈھن گونج اُٹھی۔ ”اب اس وقت کون ہو سکتا ہے؟“ عثمان نے ایک طویل جہا ہی لے کر ریوڈی گرام کاپٹ زور سے بند کر دیا اور کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ”وہی ہو گا کہ پارام کا آدمی۔“ انکم ٹیکس کے قسٹے والا۔“ میں نے رائے ظاہر کی اور انتہائی بوریت (boredome) کے احساس سے نڈھال ہو کر کروٹ بدل لی۔

”ہلو۔ ارے بھی کوئی ہے اندر۔“ باہر سے پھر آواز آئی۔ ”یہ کہ پارام کا چیرا اسی قطعہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تو کچھ چارلس بوڈلر کی سی آواز ہے۔“

صبیحہ کے کان کھڑے ہو گئے۔ ”ڈوب جاؤ تم خدا کرے۔“ میں اور بھی زیادہ بوری ہو کر صبیحہ کو کھا جانے کے مسئلے پر غور کرنے لگی۔

باہر اندھیرے میں عثمان اور اس آدھی رات کے ملاقاتی کے درمیان انتہائی
 اخلاقی اور تکلف میں ڈوبا ہوا مکالمہ بزبانِ انگریزی ہو رہا تھا۔
 ”ہمارے یہاں اچانک بجلی فیل ہو گئی ہے۔ میں یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ
 ساری لائن ہی بگڑ گئی ہے یا صرف ہمارے یہاں ہی خراب ہوئی ہے۔“
 ”ہمارے یہاں کی بجلی تو بالکل ٹھیک ہے۔ آپ فیوز کے تار لے جائیں۔“
 پھر کچھ کھٹ پٹ کے بعد عثمان نے سرپٹ ریک کی دراز میں سے تاروں کا
 لچھا نکال کر ہمسائے صاحب کی نذر کیا اور وہ بوٹوں کی چاپ برآمدے کی
 سیڑھیوں پر سے اتر کے روش کی بجری پر سے ہوتی ہوئی چھانٹتے ہوئے
 کرلین کے اندھیرے میں کھو گئی۔ اگست کی رات کا نابھی چاند سرو کے درختوں
 پر جھللا رہا تھا۔

یہ آصف تھا۔ آصف انور۔ تمہیں یاد ہے نہ ارہ! میں نے ایک دفعہ
 تمہیں لاہور سے لکھا تھا کہ ہماری ایک سیدہ دلچسپ اور اعلیٰ قسم کے خاندان
 سے دوستی ہو گئی ہے۔ ہمارے ہمسائے ہیں بچارے۔ بالکل ہمارے sort کے
 لوگ۔ اب کی کرسمس میں تم دہرہ دون کے بجائے لاہور آ جاؤ تو خوب
 کریں۔ ہم سب نے ماہِ رُخ کی ریاست تک بیل گاڑیوں پر جلنے کی اسکیم بنائی
 ہے۔ یہ آصف کی یہ تجویز تھی جسے سہمی آفت کہتی تھیں۔ انہی دنوں ماہِ رُخ
 کی نہی نہی شادی میڈیکل کالج کے ایک موٹے اور بے انتہا دلچسپ لڑکے سے ہوئی تھی
 اور اس نے ہم سب کو ہمسایوں سمیت اپنے گاؤں مدعو کیا تھا۔
 اللہ — وہ دن — وہ راتیں!

ہماری اور ان کو ٹھیوں کے بیچ میں وارث روڈ کی آخری لین اور اس کے دونوں طرف باغ کی نیچی سی دیوار تھی۔ ہم اسی دیوار کو پھلانگ کر ایک دوسرے کے یہاں جایا کرتے تھے۔ اکثر جاٹوں کی دھوپ میں اپنی اپنی چشتوں پر بیٹھ کر گراموفون بجانے کا مقابلہ رہتا۔ خطرے کے موقعوں پر ان بہن بھائیوں کو آئینے کی چمک کے ذریعے ایس۔ او۔ ایس کے پیغام بھیجے جاتے۔ یہ معلوم ہو کر کہ یہ لوگ بھی یو۔ پی۔ کے ہیں کس قدر خوشی ہوئی تھی۔ سب سے بڑی بہن ذکیہ، امینہ آپا کے ساتھ ایم۔ اے۔ کر رہی تھیں۔ شکیلہ اور پروین صبیحہ کے ساتھ سیکرٹری ہاٹ میں تھیں۔

ہمسف صاحب ان کے اکلوتے بھائی تھے۔ سب کی آنکھوں کا تارا۔ متوقع تھے کہ ہم لوگ بھی انہیں آنکھ کا تارا سمجھ کر ہمیشہ ان کے fusses برداشت کریں گے۔ آپ ایف۔ سی۔ میں کیمسٹری میں ایم۔ ایس۔ سی۔ فرما رہے تھے۔ پٹرول کے دنگ تبدیل کرنے کے تجربوں کے بے انتہا شوقین تھے۔ سیٹی کے ساتھ ساتھ وائٹن بہترین بجاتے تھے۔ معاملہ تھا کہ بھی خوبصورت ہیں۔ گھر کی بزرگ خواتین اور بچوں سے خوب دوستی کر لی تھی۔ کار اتنی تیز چلاتے تھے کہ ہمیشہ چالان ہوتا رہتا تھا۔ لاہور کے سارے چودا ہوں کے پولس میں آپ سے اچھی طرح واقف تھے۔ مال پر سپاہ ل جاتی ہوئی الٹرا موڈرن لڑکیوں کو کار میں لفٹ دینے کے تجربوں کے بہت قائل تھے۔ مختصر یہ کہ انتہائی دلچسپ آدمی تھے آپ۔

اور امینہ آپا۔ ان کا یہ عالم کہ ہم سے تین چار سال پہلے کیا پایا ہوئی تھیں کہ قیامت آگئی تھی۔ صبح سے شام تک ہم سب کو بوس کرنے کو مستعد۔ بی۔ اے۔

انہوں نے علی گڑھ سے کیا تھا۔ ایم۔ اے۔ اور بی۔ ٹی۔ کے لیے ہمارے
یہاں آگئی تھیں اور ہماری جان کے لیے مستقل قسم کا کورٹ مارشل۔ مجھے
وہ شام کتنی تفصیل سے اچھی طرح یاد ہے۔ جیسے یہ باتیں ابھی ابھی کل ہی
ہوئی ہیں۔

سفید کشمیری اون کا گولا سلجھاتے ہوئے میں نے آواز میں رقت
پیدا کر کے کہا تھا:

”امینہ آیا!“

”فرمائیے، کوئی نئی بات؟“

”امینہ آیا، پیاری آج شام کو اوپن ایر میں غنڈا آپا کا رقص ہے۔“

”جی۔ شہر بھر کے سارے پروگرام آپ کو نہ بانی یاد ہوتے ہیں۔ اور

پلانڈ میں آج کون سا فلم ہو رہا ہے؟“

”امینہ آیا! ہنک۔ ہول۔“

”ارشاد؟“

”امینہ آیا ہمیں لے چلو۔ اودے شکر اور غنڈا آپا روز روز کہاں نظر

آئیں گے بھلا۔ ذکیہ باجی اور شکیلہ وکیلہ سب جا رہی ہیں۔“

”تھوڑے بھی ساتھ ہوگا۔“

”مجبوراً چلے گا بچارا۔ کار وہی ڈرائیو کرتا ہے۔ ان کا ڈرائیور تو

آجکل بیمار ہے۔“

”کوئی ضرورت نہیں۔“

اور میں تقریباً روتے ہوئے جا کر اپنے ڈرائیونگ روم کی کھڑکی میں جا کر
اون سلجھانے میں مصروف ہو گئی۔

شام کا اندھیرا پھیلنا جا رہا تھا۔ نیچے موٹر گئرج کی طرف جانے والی سڑک
پر سے وہ آتا ہوا نظر آیا۔ کھڑکی کے پاس پہنچ کر ٹارچ کی روشنی تیزی سے چمکا
کر اس نے آہستہ سے کہا :
”ہلو ، جولیٹ !“

”خوب — معاف فرمائیے ، میں کم از کم آپ کے ساتھ تو سیر مینڈ
کرنے کو تیار نہیں ہوں۔“

”آہ — آہ — وہ دیکھو سرور کے پیچھے سے چاند کس قدر اسٹائل
سے چھبانک رہا ہے۔“
”لو اوں امینہ آیا کو !“
”پتو او کی !“

اندکمرے میں سے غرارے کی سرسراہٹ کی آواز سنائی دی۔
”چپ ، آگئیں امینہ آیا۔“ میں ذرا اندھیرے میں جھجک گئی۔ امینہ
آپا شاید گیلری کی طرف جا چکی تھیں۔ وہ دیر تک نیچے کھڑا باتیں کرتا رہا۔
”گیسی خالص ۱۲ بور ہیں تمہاری امینہ آیا۔“ وہ بی۔ ایس۔ سی۔ تنک
علی گڑھ میں پڑھ چکا تھا اس لیے ہم آپس کا ضروری تبادلہ خیالات وہیں
کی زبان میں کرتے تھے۔

”۱۲ — ۲۲ بلکہ آغا خانی بور۔“ میں نے اس کی رائے سے اتفاق

نے جواب دیا۔

”وہی عالم بالا والا۔“ صبیحہ نے کہا۔

”وہ جو تم علی گڑھ کے کسی شاعر کے ترنم میں پڑھا کرتے ہو، وہی بھی۔“

مغرب میں اک تارا چمکا۔ ”میں نے کہا۔“

”کیا کہیے مجھے کیا یاد آیا؟ آپ تو سامنے تشریف رکھتی ہیں، مجھے اس

وقت کیا خاک یاد آئے گا؟“

”شروع ہوئی اتراہٹ۔“

پھر ہم دیر تک اس سے سنتے رہے :

مغرب میں اک تارا چمکا

کیا کہیے مجھے کیا یاد آیا

جب شام کا پرچیم لہرایا

کیا کہیے مجھے کیا یاد آیا

فضا خاموش تھی — دور آسمان کی نیلگوں بلندیوں میں چند چھوٹے چھوٹے

روپے ستارے جگمگا کر دھندلکے میں کھو گئے۔

”کیا سچ عجیب یہ مدہم نام ہے ہماری قسمتوں کی اکیلی لاہوں پر جھلملاتے ہیں۔“

صبیحہ نے کچھ سوچتے ہوئے، اُنہستہ آہستہ، جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

”اور کیا — کتابوں میں جو لکھا ہے۔ شیرو کا۔“ آصف نے فوراً

بڑی مستعدی سے ذرا عالمانہ انداز میں کہنا شروع کیا، ”قول ہے کہ....“ وہ اس قدر

Tom boyish تھا اور بعض دفعہ حیرت ہوتی تھی کہ ایسے طفلانہ مزاج کا

لڑکا بڑوں کے سامنے اور تکلف کی سوسائٹی میں کس طرح اتنا سنجیدہ بن جاتا ہے۔

ہم سب پھر چپ ہو گئے۔ خاموش رات اور کھلی ہوئی فضاؤں کی موسیقی میں خوابوں کی پریاں سرگوشیاں کر رہی تھیں: محبت — زندگی — محبت — زندگی — او بلند و برتر خداوند!

سیاہ افق کے قریب ایک بڑا سا روشن ستارہ ٹوٹ کر ایک لمبی سی چمکیلی لکیر بناتا ہوا اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہم آسمان کو دیکھنے لگے۔

”کوئی بڑا آدمی مر گیا۔“ میں نے کہا۔
 ”حقیقی؟ امینہ آپا دی جہاں تہا گئے۔“ آصف نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔
 دوسرے لحظے ایک اور ننھا سا تارا ٹوٹا۔
 ”اے ان کے سیکرٹری بھی —“ عثمان چلا یا۔

اس رات بہت سے ستارے ٹوٹے اور ہم ساری باتیں چھوڑ چھاڑ کر آسمان کو دیکھتے رہے۔ اور جو ستارہ ٹوٹا اس کے ساتھ کسی بڑے لیڈر کو چپکا دیتے۔

”ساری درکنگ کمیٹی ہی سفر کر گئی۔“ آخر میں آصف انتہائی رنجیدہ آواز میں بولے۔

امینہ آپا نے ہماری باتیں نہیں سنیں ورنہ خیریت نہیں تھی۔ وہ بھی مشغولیت سے ہمارے ایک سوشلسٹ قسم کے بھائی اور ذکیہ باجی کے ساتھ سیاسیات پر تبصرہ کر رہی تھیں: ”راجندر بابا اور ڈاکٹر ذاکر نے اس وعدہ پہی کہا تھا۔“
 ”وردھاسے لڑتے ہیں شری یت چندر شیکھر جی نے مجھے بھی یہی بتایا تھا کہ

اکھنڈ بھارتیہ گھاسیہ گیند بلا بھارت — سوشلسٹ بھائی نے کچھ کہنا شروع کیا۔
 ذکیہ باجی بیحد عالمانہ اور مفکرانہ صورت بنائے ان کی طرف عقیدت کے ساتھ متوجہ تھیں۔
 ”اب یہاں سے بھاگنا چاہیے۔“ اصف نے چپکے سے کہا۔ اور ہم سب ان
 سیاست دانوں کو وہیں چھت پر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے چھوڑ کر منڈیروں پر
 سے چھلانگتے ہوئے نیچے اتر آئے۔

دوسرے روز صبح کی چاء کی میز پر انہیں سوشلسٹ بھائی نے، جو تین چار
 دن سے بمبئی سے ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے، اپنی سیاہ فریم کی عینک میں سے،
 جو ان کی لمبی سی ناک پر بیحد اٹلکچوٹل انداز سے رکھی تھی، غور سے دیکھا۔ وہ
 مستقل تین روز سے خاموش قسم کا پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ ہم لڑکیاں ان سے وہ سب
 کتا ہیں اور پمفلٹ خرید لیں جو ان کے زبردست چرمی بیگ میں بند ہمارے ذہنوں
 کی سیاسی تربیت کا انتظار کر رہے تھے۔

”شاہ رخ آیا، اکھنڈ بھارتیہ گھاسیہ گیند بلا بھارت —“ عثمان نے چاڑھائی
 میری طرف دھکیلتے ہوئے چپکے سے کہا۔ مجھے اور حبیب کو زور کی ہنسی آگئی۔ امینہ آیا
 نے عثمان کی بات سن کر ہمیں ہنستے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے ہم پر کھا جانے والی
 نظریں ڈالیں اور چلتے بننے میں مہمی کی مدد کرنے لگیں۔ وہ ہمیں سدھارنے کی
 طرف سے بالکل ناامید ہو چکی تھیں۔ غسل خانے میں چھوٹا غارف ہناتے ہوئے زور
 زور سے گارہا تھا: ”مغرب میں اک تارا چمکا — مغرب میں اک تارا چمکا —“ اور
 سوشلسٹ بھائی جلدی جلدی سفتہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔

دو پہر کو ڈرائنگ روم کے فرش پر امینہ آیا اور ان کی رفیقوں کی ایک میٹنگ ہو رہی

تھی جو سوشلسٹ بھائی کے بمبئی سے آنے کے اعزاز میں منعقد کی گئی تھی۔ ہم نے شیشوں میں سے جھانک کر دیکھا۔ کس قدر اسٹائل سے وہ سوشلسٹ بھائی پائپ کا دھواں اڑا رہے تھے۔

اسی وقت آصف سیٹی بجاتا ہوا نکلا: ”یا اللہ! کیسی کیسی مخلوق تم نے نوشتہ اپنے یہاں جمع کر رکھی ہے۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”چپ، جانے ہو سوشلسٹ بھائی صبیحہ سے شادی کرنے کی فکر میں ہیں۔“ میں نے بتایا اور آصف کا مارٹ فیل ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شام کو بھی تفصیلاً اپنے دوستوں کو ہم نے اس میٹنگ کی کاروائی کی رپورٹ سنائی کہ ہمارے گھر پر ہندوستان کی کیسی کیسی مقتدر اور اعلیٰ وارفع ہستیاں آتی ہیں۔ آصف نے پوچھا: ”کیا واقعی سوشلسٹ بھائی والی بات سچ ہے؟“ ”اور کیا۔ تم کو کم از کم ڈویل ٹولرنا ہی پڑے گا۔“

”اور کون کون لوگ تھے یہ۔“

”تم سب سے باری باری ڈویل لڑو۔“

”— کو ایک بار میں نے بھی دیکھا تھا۔ ذکیہ باجی! خدا کی قسم یہ بیس واڑھی۔ عارف نے اپنی معلومات سے اضافہ کرنا چاہا۔

”اور ایک صاحب ہیں، امینہ آپا کے خاص رفیق، جن کے ساتھ وہ لکھنؤ میں پرکھات پھیر لوں کے گیت لکھا کرتی تھیں۔ وہ یوں اچک اچک کر چلتے ہیں۔“ عثمان نے باقاعدہ demonstrate کر کے بتایا۔

”لکھنؤ میں ریڈیو اسٹیشن پر میں نے سلام صاحب کو دیکھا تھا۔ اس قدر —

بس کیا بتاؤں — جو لڑکی فی البدیہہ ان کو نظر آتی ہے اس پر ایک نظم لکھ ڈالتے ہیں۔“ صبیحہ صاحبہ نے ارشاد کیا تاکہ آصف اور جلے۔

”فی البدیہہ نظر آتی ہے؟ ذرا اپنی اردو پر غور کیجیے۔“ بیس نے جل کر آصف کی حمایت میں کچھ اور کہنا چاہا لیکن پیچھے سے شکیلہ کی آواز آئی: ”ارے خرگوشو! امینہ آپا ادھر آرہی ہیں۔ اپنی برادری والوں کے متعلق ایسی باتیں کرتے پایا تو جان کی خیر نہیں۔“ امینہ آپا اور سوشلسٹ بھائی پائپ کا دھواں اڑاتے، ہاتھ میں تین چد تبا کو کے ڈبے منبھالے واقعی لان کی طرف چلے آرہے تھے سہم سب بھیگی بلیوں کی طرح ادھر ادھر مھاگ گئے۔

کچھ عرصہ بعد سوشلسٹ بھائی بمبئی واپس چلے گئے۔ بارشوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ ماہِ مَرخ کے شوہر کی جب میڈیکل کالج میں چھٹیاں ہوئیں تو وہ چند روز کے لیے اپنی سسرال کے گاؤں سے ہمارے یہاں آگئے۔ بڑے انتظام سے آصف سے اس کا پہلی بار تعارف کرایا گیا۔ اس کے گپچو سے شوہر صاحب، جو ڈاکٹری کے پانچویں سال میں پڑھتے تھے، بے حد جلے کہ کیسے اسرارٹ اور شاندار لڑکے سے ان لوگوں کی دوستی ہوئی ہے۔ ماہِ مَرخ کے آنے پر ہم نے بہت سے پروگرام بنائے تھے لیکن مستقل بارش ہونے لگی اور ہم کوئی ایکٹیوٹی ویٹ نہ کر پائے۔

اس روز صبح جب میں کالج جانے کے لیے موٹر خانے میں سائیکل نکالنے کے لیے گئی تو ہمارے ٹماٹر یا چتندر جیسی شکل والے کشمیری چیرا اسی نے اپنی سُررخ لمبی لمبی مونچھیں بے حد مفکارانہ انداز میں ہلا کر کہا: ”بی بی جی آج تو کچھ برسات کا امداد ہو رہا ہے، مدرسے مت جاؤ۔“

میں چڑ گئی۔ اندر ماہ رخ پچاس مرتبہ کہہ چکی تھی کہ ”تم کو آج کالج
قطع نہیں جانا چاہیے، برج کھیلیں گے، نئے ریکارڈ بجائیں گے اور آصف کو بلا کر
باتیں کر میں گے۔“

میں نے تقریباً چلا کر کہا: ”علی جو باتم سیدھے میری سائیکل نکال کر
صاف کرو۔ سمجھ۔ میں ضرور جاؤں گی کالج۔“

”ضرور جاؤ۔ اور جہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ آج ریونی ڈسے کی چھٹی ہے تو
محترمہ بھیجتی ہوئی تشریف لے آئیے گا۔ اترا ہی گئیں بالکل۔“ صبیحہ نے
ڈرائیگ روم کی کھڑکی میں سے جھانک کر کہا۔

”بی بی، صاحب اتنے ہی ہوں گے۔ میں موٹر پر آپ کو پہنچا دوں گا۔“ علی جو
نے پھر مونچھیں ہلایں۔ میں نے کچھ جواب نہیں دیا اور اس کے ہاتھ سے سائیکل لے
کر تیزی سے نکل کر سڑک پر آ گئی۔ اسی وقت آصف اپنے پچھاٹک سے باہر نکلا
تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے اپنی سائیکل میرے ساتھ ساتھ کر دی۔ یہ پہلا موقع
تھا کہ گھر کے باہر سہارا ساتھ ہوا تھا۔

”ہلو۔ آپ کی تھو تھنی کیوں چڑھتی ہوئی ہے؟“

”آپ سے مطلب؟“

”اوہ تو کوئی آپ خفگی فرما رہی ہیں۔ جرم! کیا سوشلسٹ بھائی

آپ کے لیے بھی پیغام دے گئے ہیں؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں سائیکلیں برابر چلتی رہیں۔ وارث روڈ
بالکل خاموش اور بھیگی بھیگی پڑی تھی۔ سوکھے تالاب کے نزدیک کسی بدتمیز نے

لگا کر کہا: ”اے سادوں کے نظارے ہیں۔“ اور غصے کے مارے میرا جی چاہا کہ بس مر جاؤں۔

ابھی ہم سڑک کے موڑ تک بھی نہ پہنچے تھے کہ بارش کا ایک زوردار ریلہ آگیا۔
”آخر تم جا کہاں رہی ہو بھئی؟“

”جہنم میں۔“ پھر تم بولے۔ اور میں نہ جانے کیوں جیل روڈ پر مڑ گئی۔
ابھی میں گھر سے بہت دور نہیں گئی تھی۔ درختوں کے جھنڈ میں سے اپنی کوٹھی کی چھت اب بھی نظر آ رہی تھی لیکن واپس جا کر شکست کا اعتراف کرنے کی بہت نہ پڑی۔
”شاہ رخ گھر واپس جاؤ۔“
”نہیں۔“

”کیا صبیحہ سے صبح صبح لڑائی ہوئی ہے؟“
”آپ کو کیوں اتنی میری فکر پڑی ہے۔ اپنا راستہ لیجیے آپ۔“
”اوتھ نہیں یوں بیچ منجھڑھار میں چھوڑ جاؤں۔“
”آپ میری حفاظت کا حق کب سے رکھتے ہیں؟“

”اچھا میں بتاؤں بہترین ترکیب۔ یہاں پہاڑی پر کسی سایہ دار درخت کے نیچے
رک جاؤ۔ اور حجب بارش کم ہو جائے تو جا کر کہہ دینا کہ صرف ایک پیرڈر اسٹنڈ کر کے
آ رہی ہوں۔“

”جی ہاں، اور آپ بھی اس درخت کے نیچے تشریف رکھیں۔ اس نازک خیالی کی
داد دیتی ہوں۔“

”اچھا تو اسی طرح بارش میں سڑکوں کے چکر لگاتی رہیے۔ میرا کیا ہے، غموں

ہو گا، مرجاؤ گی۔“ اس نے واقعی جل کر کہا اور اپنی سائیکل وارث روڈ کی طرف موڑ لی۔

”مرجاؤ تم خود۔“ میں نے ذرا زور سے کہا۔ وہ کافی دیر نہکل گیا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ واقعی یوں لڑکوں کی طرح سڑکوں پر چکر لگانا کس قدر بڑبڑت حماقت ہے۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا: ”آصف!“

وہ چپ رہا۔

”آصف صلح کر لو۔“

”پھر لڑو گی؟“

”نہیں۔“

”وعدہ فرمائیے۔“

”وعدہ تو نہیں لیکن کوشش ضرور کروں گی۔“ میں نے اپنا پسندیدہ اور نہایت

کارآمد جملہ دہرایا۔

”گھر چلو واپس۔“ اس نے حکم لگایا۔ میں نے اسی میں عافیت سمجھی کیونکہ اچھی

خاصی سردی محسوس ہونے لگی تھی۔ چنانچہ میں نے خاموشی سے اس کے ساتھ

چلنا شروع کر دیا۔ ابھی ہم وارث روڈ کے موڑ پر پہنچے تھے کہ کیا نظر آیا کہ چلی آ رہی

ہیں امینہ! آپا کار میں بیٹھی ہوئی نہاٹے ہیں۔ ہمارے قریب پہنچ کر زور سے بریک

دبا کے انہوں نے کار روک لی اور سائیکل پر بیٹھے بیٹھے میری نوح فی الفور قصصِ عنصری سے

عالمِ بالا کی طرف پروانہ کر گئی۔ انہوں نے مجھے بالکل سالم کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”آپا! میں کالج سے آ رہی تھی کہ توہ سڑک سے میں دیکھیے بارش آگئی۔“ میں

نے اپنی دہلی ہوئی اُوار بے انتہا مری ہوئی پائی۔

”اہو، آپ کا کلچ اب اتوار کے روز بھی کھلتا ہے۔“

اور اس وقت مجھے یاد آیا کہ آج کمبخت اتوار تھا۔ بھگی بلی کی طرح میں بچاری ان کے پاس جا بیٹھی۔ ڈرائیور نے سائیکل پیچھے باندھ لی اور ہم چل دیے گھر کو۔ امینہ آپانے اخلاقاً بھی اُصف سے نہ کہا کہ تم بھی کار میں آ جاؤ۔ وہ بچارا بھگتا بھاگتا نہ جلنے کہہ کر چلا گیا۔

گھر پہنچ کر اتنے زور کی ڈانٹ پلائی ہے امینہ آپانے کہ لطف آ گیا۔

اس سانحے کے بعد کچھ عرصے کے لیے اُصف کے ساتھ برج اور کیرم موقوف، وائیلن، سیٹیاں، مارچ اور آئینے کی چپک کے ذریعہ ایس۔ او۔ ایس۔ کے پیغامات ملتے تھے۔ اور مغرب میں جھلملاتے تاروں کے سارے رومان کا خاتمہ بانخیر ہو گیا۔

میڈیکل کالج جب کھلا تو ماہِ رُخ اپنی ریاست واپس چلی گئی۔ ایک روز ہم نے سنا کہ عارف ہماری بدعاقبتی سے خفا ہو کر مری جا رہا ہے۔ دراصل وہ ضروری کام کے لیے دکان جا رہا تھا۔ بہر حال ہم کو اس کا بے حد افسوس تھا کہ محض امینہ آپا کی وجہ سے کیسا اچھا اور دلچسپ دوست ہم سے ناراض ہو گیا۔ مری میں اس کے چچا رہتے تھے جن کی بھورے بالوں اور سبز آنکھوں والی خوبصورت لڑکی سے اکثر اس کی منگنی کا تذکرہ کیا جاتا تھا۔ پھر اس روز ہمیں کتنی خوشی ہوئی ہے جب یہ معلوم ہوا ہے کہ امینہ آپا مسلم گزرتا کالج میں انکو کس کی لیکچرر ہو کر علی گڑھ جا رہی ہیں۔

جانے والی شام وہ بڑے سکون کے ساتھ آٹھ آٹھ کے سامنے کھڑی اسٹیشن جانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ میں نے ان کی نظر بچا کر کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ وہ سرو کے درختوں کے اس پار اپنے کمرے میں لمپ کے ساتھ انتہائی انہماک سے پڑھنے میں مصروف تھا۔ اس وقت میں نے سوچا کہ کاش وہ روٹھا ہوا نہ ہوتا تو ہمیشہ کی طرح امینہ آپا پر کوئی ایکٹیوٹی کرتے۔ سنگھار میز پر سے دستی آئینہ اٹھا کر اس کی چمک کے ذریعے اسیس۔ او۔ اسیس۔ کا پیغام بھیجنے کی فکر کر رہی تھی کہ امینہ آپا نے جھٹ میرے ہاتھ سے آئینہ لے لیا اور اس میں اپنے بالوں کا جائزہ لینے لگیں اور میں ان کے علی گڑھ پہنچتے ہی کسی حد سے زیادہ وحشت زدہ پروفیسر کے عشق میں مبتلا ہو جانے کے انہماک پر غور کرنے لگی۔ لیکن خدا ایسی تجویزیں قبول کرتا ہے! امینہ آپا جارہی تھیں۔ میں نے چپکے سے صبیحہ سے کہا کہ وہ باغ کی پھلی دیوار پر اسیس۔ او۔ اسیس۔ (صبیحہ، عثمان، شاہ رخ) کا پیغام لکھ آئے۔ صبیحہ نے کوئلے سے لکھ دیا:

”مت جاؤ۔“

صبح کو اس کے نیچے لکھا ہوا ملا: ”ضرور جاؤں گا۔“

اور آصف بھی چلا گیا۔ بڑی جان جلی۔ لیکن کیا کرتے۔ اس کے کچھ غرضے بعد سرا کی چھٹیوں میں ہم زارہ کے پاس دہرہ دوں چلے گئے۔

وہاں ایک رات زارہ اپنی ایک دوست کے ساتھ اوڈین سے نکلی کر باہر اندھیرے میں جب اپنی کار میں بیٹھی اور کہا کہ غفور، پریمیلا بابا کو لٹن روڈ پہنچاتے ہوئے اب سیدھے گھر چلو۔ سامنے ڈرائیور کی سیٹ پر سے کسی صاحب نے مری ہوئی

آواز میں عرض کیا کہ ”جی میں غفور قحطی نہیں ہوں۔ میرا نام پائیلٹ آفسر آصف انور ہے۔ اور تجھے آپ سے مل کر یقین فرمائیے انتہائی ’قبی سسرت محسوس ہوئی ہے۔“ اور کلاسٹارٹ کر دی گئی۔

زارہ اور پرمیلا خوف اور غصے سے چلا اٹھیں۔ ”آپ کون ہیں اور ہماری کار میں کیوں گھس گئے؟ روکیے فوراً۔“

”جی اتفاق سے یہ کار خاکسار کی ہے۔ دہرہ دوٹن میں اوڈین کے سلسلے ایک ہی طرح کی دو کاروں کا پارک ہو جانا بہت زیادہ ناممکنات میں سے نہیں ہے۔“
”دختم کیجیے اپنی تقریر اور روکیے موٹر۔“

”پرمیلا بابا کو لٹن روڈ پہنچا دیا جائے گا۔ اس قدر پریشان نہ ہوئیے، کمر بہت زیادہ ہے۔ رات بے حد سرد ہے اور ہم آدھے رستے آگے رہیں۔“

دو نوں بچیاں بچاری جھنجھلاہٹ اور غصے کے مارے کچھ اور کہہ بھی نہ پائی تھیں کہ چند منٹوں میں کار زناٹے سے ہماری برساتی میں داخل ہو گئی۔

معلوم ہوا کہ آپ دہرہ دوٹن میں ایئر فورس کے انٹرویو کے بعد میڈیکل کالج آئے ہوئے ہیں۔ خوب آپ کو آڑے ہاتھوں کیا گیا۔ ہم نے ڈانٹا کہ تم سب سے رخصت

ہوئے بغیر ہی اس طرح اچانک مری چلے گئے۔ اس نے بگڑ کر کہا کہ امیغہ اُپانے کیوں شاہ رخ کو سائیکل پر بارش میں بھینکے پر ڈانٹ بلائی تھتی۔ سوشلسٹ بھائی

منطق اور جغرافیے کے کس نقطے کی رو سے صبیحہ سے شادی کرنے کی فکر کر رہے تھے اور ماہِ مرغ کے میاں، قبلہ ڈاکٹر صاحب، کس لیے اس سے جلے جاتے تھے؟ مختصر یہ

کہ ہم لوگوں میں صلح صفائی ہو گئی اور پھر پہلے کی طرح دوست بن گئے۔

پھر وہی برج، کیرم، شرارتیں اور گانے۔ وہی مغرب میں ایک تارا چمکا۔ آتشدان کی روشن آگ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہم سب اس سحر انگیز آواز اور وائٹن کے نغمے سنتے :

کیا کہیے مجھے کب یاد آیا
کیا کہیے مجھے کب یاد آیا
ٹیلے کی طرف چرواہے کی بنسی کی صدا ہلکی ہلکی
اور شام کی دیوی کی چُنری شائوں سے پرے ڈھلکی ڈھلکی
مغرب میں اک تارا چمکا۔ !

— اور پھر جو ایک روز میں نے آصف کے اپنے بہنوئی بننے کے امکانات پر نظر کی تو مجھے یہ خیال مہبت خاصا پسند آیا۔ کرسس کی تعطیلات میں امینہ آیا بھی علی گڑھ سے دہرہ دون آگئی تھیں۔ مئی تک پہنچانے کے لیے امینہ آپا کے سامنے یہ تجویز پیش کر دینی بے حد ضروری تھی۔ ایک رات جب کھانے کے بعد امینہ آپا ششماہی امتحان کے پرچے دیکھ رہی تھیں میں دبے پاؤں ان کے کمرے میں پہنچی اور ادھر ادھر کی بے معنی باتوں کے بعد فرار ڈرتے ہوئے بولی : ”امینہ آپا — !“

”ہوں۔“

”امینہ آپا ایک بات سنئے۔“

”فرمائیے۔“

”ار — یعنی کہ — اگر آصف کی شادی کر دی جائے تو کیسا رہے ؟“

”بہت اچھا رہے۔“

”میرا مطلب ہے صبیحہ کے ساتھ۔“

”آپ کی بلند نظری کی داد دیتی ہوں۔ کس قدر اعلیٰ خیالات ہیں۔“

”لیکن — لیکن امینہ آپا آپ کو معلوم نہیں کہ آصف اور صبیحہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، یعنی دوسرے نفظلوں میں یہ محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔“
میں نے ذرا ایسے mild طریقے سے کہا ”امینہ آپا کو دفعۃً shock نہ ہو جائے۔
امینہ آپا کی انگلیوں سے قلم چھوٹ گیا اور اس طرح دیکھنے لگیں جیسے اب انہیں قرب قیامت کا بالکل یقین ہو چلا ہے۔

”— کیا کہا —؟ محبت! محبت!! اُن کس قدر تباہ کُن، مخرب الاخلاق خیالات ہیں۔ محبت۔ یا اللہ۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایسی واہیات باتیں بھی تم لوگوں کے دماغ میں گھس سکتی ہیں۔ میری ساری تربیت —“

لیکن امینہ آپا دیکھیے تو اس میں مضائقہ کیا ہے؟ آصف نوکر بھی ہو گیا ہے۔
ایک دم سے ساڑھے چھ سو کا اسٹارٹ اسے مل رہا ہے۔ وہ بہت اچھا لڑکا ہے۔
صبیحہ بھی بہت اچھی لڑکی ہے۔ دونوں کتنی اچھی گز رہے گی اگر ان کی شادی۔“
”شادی — شادی — کیا اس لغویت کا خیال کیے بغیر تم لوگ رہ ہی نہیں سکتے۔ تمہیں دنیا میں بہت کام کرنے ہیں، طوفانوں سے لڑنا ہے، ملک کا مستقبل سنوارنا ہے۔“

”پر امینہ آپا ایک کے بجائے دو انسان ساتھ ساتھ طوفانوں سے زیادہ بہتر طریقہ پر لڑ سکتے ہیں۔ اور آصف تو ہوائی جہاز اڑانے لگے گا۔!“
”چپ رہو — آصف — ہمنہ — یہ لڑکا مجھے قطعی پسند نہیں۔“

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ کچھ بہت عجیب سا شخص ہے۔ بچوں کی طرح ہنستا ہے۔ لڑکیوں میں حار سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے اور غضب یہ کہ کل شام صبیحہ کو ڈارنگسٹ کمرہ کر پکار تھا — انتہا ہو گئی!“

امینہ آپا کچھ اور لیکچر پلا تیں اس لیے میں نے اپنی خیریت اسی میں دیکھی کہ چپکے سے اٹھ کر چلی آؤں۔ اپنے کمرے میں آ کر میں سوچنے لگی: آصف مجھے قطعی پسند نہیں۔ ایک آنکھ نہیں سمجھتا۔ لڑکیوں میں حد سے زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ تو کیا اسے لڑکیوں کی بجائے الماریوں اور چاء کے گچھوں میں دلچسپی لینا چاہیے؟ اب کیا کیا جائے؟

آصف صاحب ٹریننگ کے لیے انبالہ اور پھر شاید پونا تشریف لے گئے اور بہت جلد تہایت اعلیٰ درجے کے ہواباز بن گئے۔ انتہا سے زیادہ daring اور خطرے کی اڑانیں کرنے میں مہر اور پیش پیش۔ طیارہ بھی آپ اسی انداز سے اڑاتے جیسے مال پر موٹر چلا رہے ہیں۔ حادثوں سے کئی بار بال بال بچے۔ ایک دفعہ ایک نئی مشین کی ٹسٹ فلائٹ کے لیے ایروڈروم سے اس زمانے سے نکلے کہ اوپر پہنچ کر معلوم ہوا صرف انجن آپ کے پاس ہے اور طیارے کی باڈی نیچے زمین پر رہ گئی ہے۔ ہم دہرہ دون ہی میں تھے جب وہ انبالہ سے سہارن پور ہوتا ہوا دہرہ دون آیا۔ راستے میں ڈائوننگ کے شوق میں آپ اس قدر نیچے اترے کہ ایک کوٹھی کی چھت پر لگے ہوئے ایریل ہوائی جہاز کے پہیوں میں الجھ کر ساتھ ساتھ اڑتے چلے گئے۔ اس پاس کی ساری کوٹھیوں کے تار اس طرح ہل گئے جیسے زلزلہ آ گیا ہے اور لوگ گم گم گم کر اہٹ کے شور سے پریشان ہو کر باہر نکل آئے۔ وہ کوٹھی ایک انگریز

کرنل کی تھی۔ آصف بہت ڈرا کہ کہیں وہ آصف کے افسروں سے اس کی نہایت نہ کر دے لیکن عین موقع پر اس بوڑھے کرنل کی لڑکی، جس کی خواب گاہ کے روشنیوں کے اوپر سے آپ گزر رہے تھے، آپ کے عشق میں مبتلا ہو گئی اور معاملہ رنج و رنج ہو گیا۔

پونام آصف کو ایک دم کناڈا بھیج دیا گیا۔ سمندر پار جانے سے پہلے وہ ہم سب سے رخصت ہونے کے لیے گھر آیا۔ پیا کا تبادلہ لاہور سے ہو چکا تھا اور ہم صوبہ لکھنؤ آگئے تھے۔ حمی اور خالہ بیگم نے اس کے بہت سارے امام ضامن باندھے اور عثمان اور عارف نے ڈھیروں پھولوں سے لاد دیا۔ ہم نے اس کی پسندیدہ ”ڈرمر بوائے“ ٹافی کا ایک بڑا سا ڈبہ اس کے ایچی میں رکھ دیا۔ چلتے وقت اس نے کہا: ”شاہ رخ پیاری! امینہ! پاجب علی گڑھ سے آئیں تو ان سے میرا سلام کہہ دینا اور اگر سوٹلسٹ سہائی سے صبیحہ نے شادی کر لی تو یاد رکھنا میں چپکے سے ایک روزہ ان کے گھر پریم گراہاؤں گا۔“

ہم بڑا مدے کی سیڑھیوں پر سے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے۔

”شاہ رخ — صبیحہ، ڈار لنگز۔“

”آصف! ہم ہمیشہ بہترین دوست رہیں گے نا؟“

”ہمیشہ —!“

”اور تم کناڈا سے بہت سارے پکچر پوسٹ کارڈ بھیج گے؟“

”بہت سارے۔“

”اور وہاں جتنے کانے سیکھو گے ان کی ٹیونیں لکھ لکھ کر بھیجا کر دو گے۔“

”بالکل۔“

”اور ہوائی جہاز اتنا نیچا نہیں اڑاؤ گے کہ لوگوں کے گھروں کے ایریل اور انگریز لڑکیوں کے دل ٹوٹ جائیں۔“

”قطعاً نہیں۔“

پھر وہ چلا گیا۔

بہت دنوں سمندر پار رہنے کے بعد وہ بچپی جنوری میں رخصت پر گھر آیا۔

اب وہ اس قدر ace اور شاندار ہوا یا زہن چکا تھا کہ جب وہ اپنی گرجتی

ہوئی امریکن کار میں سے اتر کر ہری کین کے بگڑے کی طرح کمرے میں داخل ہوا

ہم سب کے سب بے انتہا مرعوب ہو گئے۔ ”So the boy comes home.“

صبیحہ نے خوشی سے چلا کر کہا اور اس نے جھک کر صبیحہ کو ایک ہلکی پھلکی گڑیا کی طرح اٹھالیا۔

”اوہ ڈارلنگز — نیری ننھی خرگوشیں۔“ اور امینہ آیا یہ سن کر بے ہوش

ہوتے ہوئے رہ گئیں۔

رخصت ختم ہونے کے بعد وہ پھر اپنے مستقر پر چلا گیا اور وہاں سے ہرمی

کے فضائی محاذ پر بھیج دیا گیا۔ کچھ عرصے تک حسب معمول اس کے امیٹر گراف باقاعدگی

سے ہمارے اور اس کے اپنے گھروالوں کے پاس آتے رہے۔

اور پھر —

— میں نے آنکھیں بند کر لینی چاہیں لیکن خوابوں کا پھیلتا ہوا دھند لکا

سمٹ چکا تھا۔ وہ مانوس اور پیاری آواز نہیں اندھیرے میں ڈوبتی چلی گئیں۔ باہر

سرد کے جھنڈ میں تیز ہوا ایسی سیٹیاں بجا رہی تھیں۔ مٹی کی دات کا زرد اور بیمار چاند اس خوابیدہ، فریب خوردہ، خستہ دنیا پر اپنی اُداس کرنیں برسا رہا تھا۔ یورپ کی جنگ ختم ہو چکی۔ دوسری منزل پر ریڈیو میں شکرانہ کی سروس ہو رہی تھی۔ آرگن کی مدھم گونج اور مقدس و بلند خدا کی حمد کے نغمے فضا میں لہا رہے تھے۔ کاش، کاش آصف نہ مڑتا — کاش آصف نہ مڑتا — یا اللہ!

میں نے آنکھیں بند کر کے تکیوں میں منہ چھپا لیا۔ صبح بریگیڈ پر اسٹینی مبی اور صبیحہ سے فون پر کہہ رہے تھے: ”بگیم صاحبہ آپ کا بھانجہ — مس احمد آپ کا منگیترا انتہائی بہادری سے لڑا اور اس نے شاندار جوا مز دی سے جان دی — ہمیں اپنے ایسے لڑکوں پر کتنا فخر اور غرور ہے — بگیم صاحبہ — میری دلی ہمدردی قبول کیجیے۔“

دلی ہمدردی — اعلیٰ آپا اپنے کمرے میں ٹائپ میں مصروف تھیں۔ کھٹ کھٹ کی آواز بے ترتیب اور منتشر ہوتی جا رہی تھی۔ مٹی کی خشک ہوا میں بہل کے بادلوں کو برسائے بغیر اڑائے گئیں۔ درختوں کی زرد پتیاں شہد کی مکھیوں کی اُداس بھنبھناہٹ کے ساتھ ساتھ فضا میں بکھر رہی تھیں۔

وہ دوپہر کا غمگین وقت تھا۔ میں پچھلے برادر سے کے ایک ستون کے طویل سائے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ وہ باتیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں جو آصف کا ایک ساتھی عثمان رورور کُسنار ہا تھا — یا اللہ! اللہ — وہ ایک انتہائی سرد صبح تھی اور غصہ کا کہرہ پڑ رہا تھا جب

رائٹن کے دوسرے کنارے پر پڑھنے کے لئے لگا دیا گیا۔ بہت خطرناک کام تھا۔ پوچھا گیا کوئی آفیسر اس وقت جانے کو تیار ہے۔ آصف نے خود کو فوراً والٹیر کر دیا۔ کہہ اس قدر گہری تھی کہ سامنے چند گز کا فاصلہ نظر نہ آتا تھا۔ وہ اپنی مشینیں لے کر طیارہ گاہ سے نکلا ہی تھا کہ خطرے کے سائرن بجنے لگے۔ کہہ کے اس پار رائٹن کے دوسرے کنارے پر جرمن طیاروں کا ایک زبردست بیڑہ پہنچ چکا تھا۔ آصف بہت اونچے بادلوں میں سے ڈائیو کر کے اپنے ساتھیوں کا انتظار کیے بغیر معید دھارا رائٹن پر پرواز کرنے لگا اور چند لمحوں کی سخت فضائی جنگ کے بعد جرمن طیارہ شکن توپوں کا نشانہ بن کر نیچے دیرا کے ایک پل پر گر پڑا۔ اس کی مشینیں میں آگ لگنے سے پہلے ہی کئی امریکن اور انگریزی ہوائی جہاز اس جنگ میں حصہ لینے کے لیے پہنچ چکے تھے۔ لیکن موت — وہ کسی کا انتظار نہیں کرتی۔

وہ شاید دائرہ میں سے اپنی طیارہ گاہ کو پیغام بھیجنے میں کامیاب ہو گیا تھا جس کے پہنچنے ہی فوراً آفیسر نے کی ایک اندازی پارٹی دوسرے ہوائی جہاز پر اس کے پیچھے گئی اور پرسکون اور سرد رائٹن کے ایک ٹوٹے ہوئے پل کے قریب اس کے ہمسار کو چور چور اور جلا ہوا پایا۔ وہ مشین سے کچھ فاصلے پر بے جان پڑا تھا اور اس کے چہرے اور جسم پر کوئی خراش تک نہ تھی، بالکل جیسے وہ اٹلن بجاتے بجاتے سبزے پر تھک کر سو گیا ہو — اللہ — آصف اور موت — کیسی غلط، ناقابل یقین، غیر ممکن بات تھی — لیکن وہ وہاں شبنم آلود گھاس اور ستارہ سحری کے مرجھائے ہوئے پھولوں پر پڑا تھا۔ خارش اور سرد —

پھر جنوبی انگلستان کے اس فضائی مستقر سے اس کا سامان گھر بھیجا گیا —

کتا ہیں۔ پکچر لوپسٹ کارڈ — ڈرمر بوائے ٹٹانی کے ڈبے، ڈھیروں تصویریں جو اس نے مختلف مقامات پر اتاری تھیں — وہ ادھر سے خط جو کبھی پوسٹ نہ کیے جا سکے۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا ایک نیلے کانڈ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو اڑاتا ہوا بہت دور افق کی تنہائیوں میں کھو گیا۔ خاموش ستاروں اور دھندلی کہکشاں کے روپیلی راستوں سے پرے — بہت دور سے ایک مدھم آواز آہستہ آہستہ آرہی تھی: امینہ آیا — کاش امینہ آیا — تمہیں معلوم ہوتا کہ میں تم سے — تم سے کس قدر محبت کرتا تھا — کتنا دیوانہ وار تمہیں چاہتا تھا۔ چاہنے اور چاہے جانے کی خواہش — کیسی طفلانہ حماقت تھی — تم نے ہمیشہ میو مذاق اڑایا۔ کاش امینہ آیا تم مجھے اتنی اجازت دیتیں کہ میں تمہیں صرف ایک بار ڈارلنگسٹ کہہ کر بیکار سکوں اور پھر جاؤں — ڈارلنگسٹ — اس فضول اور انتہائی سستے سے لفظ میں میری روح، میری جان سمٹ کر آجاتی ہے۔ تم کہتی تھیں — محبت — محبت — محبت — کتنی تھوڑی سی اور بیکار افسانوں کی سی باتیں ہیں۔ اپنی نظر، اپنے خیالات کو بلند کرو، اپنی ذہنی صلاحیتوں کو سنارو — طوفانوں سے لڑو — یہ کرو — وہ کرو — امینہ آیا تمہارے لکچر — آج رات کے سرد پانیوں پر نہرو اور بھاری کپڑے چھڑا رہا ہے — ستارے بھلے کر بجھتے جا رہے ہیں۔ پائن کے اونچے درخت شمالی سمندر پر سے آتی ہوئی برفانی ہواؤں کے جھونکوں سے جاگ اٹھے ہیں۔ میرا مبارک اپنے مہیب جمود اور خاموشی گرج کے ساتھ میرے قریب شدید ملنے والی صبح کا سکون کے ساتھ انتظار کر رہا ہے۔ امینہ آیا! میں اپنی اس زندگی، کائنات کی اس

مہم اور یک رنگ جدوجہد سے تھک چکا ہوں۔ سرچ لائٹ کی تیز بجیریں پچھلی رات
 کے کالے بادلوں کو کاٹتی ہوئی افق میں گرتی جا رہی ہیں۔ میری اس دنیا سے بہت
 دور۔ بہت علیحدہ، تم اس وقت نہ جانے کیا کر رہی ہو گی۔ کیا سوچ
 رہی ہو گی۔ امینہ آیا! کاش میں تمہیں سمجھ سکتا۔ تم مجھے سمجھ سکتیں۔
 پھر ادبچے اور نیلے آسمانوں پر ایک ملکوتی نغمہ بلند ہوا۔ اور محبت کے فرشتوں
 کے بربطہ کے فقری ستارے ایک ایک کر کے ٹوٹ گئے۔ زندگی کا آخری گیت ختم
 ہو چکا تھا!



ٹوٹے تارے

انجیر اور زیتون کے درختوں اور ستارہ سحری کے پھولوں سے گھری ہوئی کسی جھیل کے خاموش اور پُر سکون پانیوں میں زور سے ایک پتھر پھینکنے سے لہروں کا لحظہ بہ لحظہ پھیلتا ہوا ایک دائرہ سا بن جاتا ہے نا! یا جب کوئی تھکا ہارا مطرب رات کے پچھلے پہر اپنے رباب پر ایک آخری مضرب لگا کر ساز کو ایک طرف رکھ دیتا ہے اور اس کے فرتی ستاروں میں سے جو لرزنا، دم توڑتا ہوا آخری نغمہ بلند ہوتا ہے۔ یا پھر جیسے سفید یا سبیل کی معصوم کلیوں کی مہک کی تیز لپٹوں میں ملفوف ہوا ایک ایک جھونکا صبح ہوتے چپکے سے اندر داخل ہو کر شمع کو بجھا دیتا اور پھر اس بجھی ہوئی شمع میں سے جہلکا سا غمگین سا دھواں لہراتا ہوا اوپر کو اٹھتا ہے نا۔

لیکن ٹھہریے بھئی۔ اس قدر شاعری کی ضرورت نہیں۔ بس یہی سمجھ لیجیے کہ ایسی ہی کچھ ناقابلِ اطمینان، ناقابلِ تشریح سی کیفیت اس وقت شاہینہ پر چھائے جا رہی تھی بلکہ حاوی ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا، نہ جانے کیا کیا محسوس ہو رہا تھا، کیونکہ ہماری اس آہی سی دنیا میں بہت سی باتیں ایسی عجیب سی ہو جاتی ہیں جن کی تشریح نہیں کی جاسکتی اور مذاں کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں آتی ہے۔

جانے کیوں، پر ایسا ہوتا ضرور ہے، ہمیشہ، کہ جب، لیکن، خیر، کہانی بے ربط ہو جائے گی۔ اور پھر آپ عقل مندوں کے نزدیک اس زندگی میں بہت سے گہرے گہرے اور اونچے اونچے نشیب و فراز ہیں۔ اور یہ زندگی ایک دورا ہے۔ ایک چھوٹا سا المیہ ہے یا طربیہ۔ یا المیہ اور طربیہ دونوں — یا ایک — خیر — افوہ —! کیونکہ یہ رخشندہ کا خط تھا جسے وہ اب تک کم از کم پچیس مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ اور اب اسے خوف ہوا تھا کہ کہیں اسے ڈاکٹر عارف سے اپنی سائیکو انالسس نہ کروائی پڑ جائے۔

زندگی بھی واقعی کیسی عجیب چیز ہے۔ بے انتہا عجیب۔ بالکل بے سرو پا۔ رخشندہ کا خط اسی طرح قالین پر پڑا ہوا تھا۔ بھیٹی اللہ یہ کرسس کی صبح تھی۔ کیرل گانے والی ٹوریاں دور نکل چکی تھیں۔ اور پہاڑی خوبانیوں کی ڈھلوان کے پرے کیتھڈرل کی دوسری طرف سے بیگ پائپ کے تیز اور مدھم سرود کی لہریں برفانی ہوا میں تیرتی ہوئی درتچے کے شیشے سے ٹکرا کر اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ہر سال یہ بیگ پائپ بجانے والے ۲۵۔ دسمبر کی صبح کو اسے اسی طرح جگا دیا کرتے تھے اور وہ جھنجھلا کر پھرتکیے میں مٹنہ چھپا لیتی تھی۔ نگراب — اب تو ساری کہانی ہی ختم ہو چکی ہے۔ توبہ — افوہ — ہوا کے ایک بھونکے سے رخشندہ کا خط اڑتا ہوا آتشدان میں جا گرا۔ اس نے اٹھ کر درجہ بند کر دیا اور دیوان پر گر گئی۔ صبح کی ہلکی ہلکی قرمزی روشنی دیواروں پر پڑ رہی تھی کیتھڈرل کا گھنٹہ بجے جا رہا تھا اور Gants brough کا ”بلو بوائے“ دیوار پر سے جھانک کر مسکرا رہا تھا۔

”بلو بلوئے۔“ شاہینہ نے آنکھیں بند کر لینی چاہیں لیکن تصویر کے ٹیشے پر بہت سی دھندلی دھندلی رنگین پرچھائیاں ناچنے لگیں۔

”جب میں بڑا ہو کر ڈیڑھی کی طرح میجر بنوں گا اور ری شتی سے شادی کروں گا تو تم اور سلیم ہمارے ہاں جہان آنا۔ میں راج پور میں یوکلپٹس کے جنگلوں میں ایک بہت بڑا اور اونچا سا چاکلیٹ اور کیاک کا گھر بناؤں گا۔ پھر اس میں ری شتی اسنووائٹ کی طرح رہا کرے گی۔“

”ہشت ندیدے، کہیں ہر وقت چاکلیٹ کھاتے کھاتے بیمار ہو پڑ جاؤ گے تو جناب عالی میں تو کبھی آپ کو دیکھنے بھی نہیں آؤں گی۔ اور ڈبل فیس لوں گی ہمیشہ۔“ سلیم تم بھی کبھی نہ جانا ان لالچی خرگوشوں کے گھر۔ میان عمر بھر پڑے رہیں گے یوں ہی۔ اور ہم تو اپنے مٹھاٹ سے ہوائی جہاز میں پھریں گے۔ صبح کو چاند میں جا کر چائے پی، دوپہر کو میکیکو پہنچ گئے، رات کو گھر۔ انا کیسے مزے کی زندگی ہوگی۔ لیکن رخشندہ نے لکھا تھا: خدا راسخی شتی میرا خط پڑھ کر اپنے آپ کو غمگین مٹ کر لینا۔ میں تم کو پورے چھ سال بعد لکھ رہی ہوں۔ کتنی طویل مدت ہے اور میں کس قدر احسان فراموش۔ یقیناً مجھے تم سے معافی مانگنی چاہیے۔ ایک یتیم اور کمزور بڑکی، جس نے تمہارے گھر پر، تمہارے گھر والوں کے رحم و کرم پر، پرورش پائی ہو اور وہ ایسی باغی اور سرکش نکل جائے۔ سوچو تو شتی شتی میں ہمیشہ ہنسے والی ری شتی کیسی عجیب باتیں لکھ رہی ہوں کیونکہ زندگی نے مجھے روزا بھی سکھا دیا ہے۔ شاید میں اب بھی تم کو خط نہ لکھتی اور تم کو معلوم نہ ہونے پاتا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہی ہوں لیکن گزشتہ ہفتے پوناسے جنگلوں آتے ہوئے میری ایمبولنس کار ایک اور

فوجی لاری سے ٹکرا کر کھڑے میں گر گئی اور میری یونٹ کے آفیسر کمانڈنگ کو مجھ سے
 پوچھ کر تمہیں میرے زخمی ہو جانے کی اطلاع دینی پڑی کیونکہ اس وسیع دنیا میں
 میری next of kin تم ہی ہو۔ پریشان نہ ہونا۔ اب میں اچھی ہوتی جا
 رہی ہوں۔ کرسس آنے والا ہے اور نہایت سرگرمی سے اس کے استقبال کی
 تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ کاغذی رہن اور رنگین جاپانی قندیلیں، مصنوعی مسکراہٹیں
 اور لالہ کے پھولوں سے بھرے ہوئے گل دان۔ کینٹین میں رات گئے تک گیتوں
 اور قہقہوں کا شور رہتا ہے۔ اپنے گھروں سے ہزاروں میل دور پڑے ہوئے امریکن
 اور آسٹریلین فوجی ہر وقت خوش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وقت چیخ پیچھ کر
 گاتے رہتے ہیں۔ انسان اپنے آپ کو خود فریبی میں مبتلا رکھنے کا کتنا شوقین ہے۔
 ”ایس بلو کاؤن“ کاریکارڈ تیزی سے بچ رہا ہے۔ یاد ہے ”بلو بوائے“ کون
 تھا؟ اللہ! اچھا اب ختم کرتی ہوں۔ ہمارا نیا مہاجر بھی اپنا راؤنڈ لینے کے لیے آنے
 والا ہے۔ اس نے ابھی مجھے کھٹے پڑھنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ یا اللہ! میں اس
 قدر احمق سی کیوں ہوتی جا رہی ہوں۔ صبح وہ مجھ پر چبکا ہوا میرا ٹیپر بچر لے رہا تھا۔
 اور میرا جی بچا رہا تھا کہ وہ فوراً وہاں سے ہٹ جائے، میرے رستے سے الگ ہو جائے۔
 اور وہ پھر نئے لاگ سٹائن پر نظر آتا ہے۔ اس کی نیلی آنکھیں دیکھ کر مجھے وہ گزرے
 دن اور پرانی باتیں اس قدر تیزی سے یاد آنے لگتی ہیں کہ جنہیں میں اس چھ سال کے
 عرصے میں بھولنے میں خاصی کامیاب ہو چکی ہوں۔ خدا کے لیے ششی مسکراؤ۔“
 دس برس پہلے کرسس کی ایسی ہی برفانی صبح تھی جب رخشندہ بھاگی بھاگی اس
 کے کمرے میں آئی تھی اور اس سے کہا تھا: ”کاہل بلی اٹھو، یہاں آگے رہیں۔“

اور شاہینہ یہ خبر سننے ہی لحاف پر سے پھینک کر برش سے جلدی جلدی بالوں کو
 ٹھیک کر آبا جہان کے کمرے میں پہنچی تھی جہاں وہ مہمان بیٹھے تھے جو اپنے بچوں
 کو سینٹ جوزفز اکیڈمی میں داخل کرنے کے لیے آئے تھے۔ برآمدے میں ڈھیروں
 اسباب پھیلا پڑا تھا اور ان بچوں کی گوری سی جی سی سیاہ فر کے لبادے میں لپیٹیں
 کی احمی سے باتیں کر رہی تھیں۔ ان کے ڈیڑھ ہی بھس باتوں میں مصروف تھے اور
 دوسری شریہ، بڑی بڑی، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والے لڑکے بے حد مسکین
 اور غمگین صورت بنائے ایک ہولڈال پر چڑھے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک برابر
 ٹانگیں ہلائے جا رہا تھا اور دوسرا جس کی ناک سردی اور زکام کی وجہ سے
 ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہی تھی، رخسندہ کے ہاتھ سے چائے دانی گرانے کی
 فکر میں تھا جو میز پر پھکی ہوئی چلے بنا رہی تھی۔

”تم نے اپنی بہنوں کو سلام نہیں کیا۔“

”ہم نہیں کیا کرتے لڑکیوں کو سلام۔ ہونہر، احمق گلہریاں۔“

”ہائیں اسلم بری بات۔“ ان کے ڈیڑھ نے ڈانٹا۔

”اچھا ہم سے دوستی نہیں کرو گے؟ لٹل بوائے بلو۔“

”وہ تمہیں اسکیٹنگ آتی ہے؟ باکسنگ کرو گی؟ ہمیں اپنی بیوقوف گڑیاں

دکھاؤ۔“ اور بہت جلد وہ چاروں کیڈبری چاکلیٹ کے البم، کیبنو، لیڈی

سیلنڈ، مکی ہاؤس اور ریل کے انجنوں کے ڈھیر میں منہمک ہو گئے، جیسے ہمیشہ

کے ساتھی تھے اور زندگی بھر اسی طرح ایک ساتھ خوبصورت اور رنگین کھلونوں سے

کھیلتے رہیں گے۔

اسلم نے سینئر کیمبرج فرسٹ گریڈ میں پاس کیا : ”بلو بوائے کیا انعام لوگے بتاؤ ؟“ رخشندہ نے پوچھا۔

”ہونہہ ، بہت انعام دینے چلی ہیں۔ ذرا شکل تو اپنی آئینے میں ملاحظہ فرمائیجیے۔ میں خود تم کو نہ دے ڈالوں گڑیا ٹیڈی بزرگوں بلن۔ مانگ کیا مانگتی ہے لڑکی ؟“

”سرتھارا ، گدھے کی دُم کہیں کے۔“

”سرتونی الحال نہیں دے سکتا۔ اس کی تجھے خود کافی ضرورت ہے۔ اور جو چاہے لو۔ اسکیٹس کی بالکل نئی جوڑی خریدی ہے ، لوگ ؟“

”جی میرے پاس خود ہیں اسکیٹس۔ آپ اپنے پاس ہی رکھیے اپنے۔“

”واللہ کیا آپ کے اسکیٹس ہیں۔ نیلام میں خریدے تھے نا۔ اور

اسکیٹنگ آپ کس قدر نفیس کرتی ہیں — گویا — موری نیا ڈمگ ڈولے رے۔ اور کرکٹ“ دو کرکٹ کھیلتی ہیں تو کرکٹ سکھا کر آپ نے میری

جان پر کیا احسان کر دیا۔ آپ تو مر کر بھی ایک بچل اور نہیں بن سکتے۔“

”اگر ہمیں بچل اور بننے ہوتے تو پھر خدا نے لڑکیاں کس معارف کے لیے بنائی تھیں۔“

نیلو فر اور نرگس کے شگوفوں سے گھرا ہوا راستہ اسی طرح طے ہوتا رہا لیکن اگر

منزلیں مختلف نہ ہوتیں تو ستاروں کی راہوں کا یقین کسے آتا ؟

اور اب اتنے برسوں کے بعد شاہینہ پھر اسی سایہ دار روش پر آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی نیچے اتر رہی تھی جس پر اس کے دل کا ساکھی کمل اس لیے اس

کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا کیونکہ وہ اس کے طبقے اور اس کے فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا اور اسلم بے دلی سے سیٹی بجاتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ اس لیے آ رہا تھا کیونکہ وہ ایک ٹائٹ کی لڑکی تھی اور وہ اس کے منگیتر کی حیثیت سے کمرسمس گزارنے دہرہ دون مدعو کیا گیا تھا۔ پھر وہ آلوچوں کی ٹہنیوں کے نیچے چلتے چلتے ایک سخت رک گئی اور اس کی طرف مڑ کے کہنے لگی :

”ٹھٹھیک ٹھٹھیک بتاؤ کیا تم واقعی میرے ساتھ خوش رہ سکو گے ؟“
 ”کوشش تو کروں گا۔“ اس نے بے تعلقی سے ایک پتہ توڑ کر کہا۔
 ”اسلم ! میں تم سے انتہا کرتی ہوں سنگھار واپس چلے جاؤ۔“

”اوہو، دُشمنہ پر کرم کرنا چاہتی ہیں آپ۔ بہت جلد اس کا خیال آیا۔ اطمینان رکھو، وہ تم سے ایک اور احسان کی آرزو مند نہیں ہے۔ وہ پوری طرح تندرست ہونے سے پہلے ہی ہسپتال چھوڑ کر کہیں اور جا چکی ہے۔“ اسلم نے بے پروائی کے ساتھ کہا۔ ہوا کا جھونکا پتوں میں سے سرسراتا ہوا نکل گیا۔

اسلم بیکامیک نہایت تلخی سے بولا : ”مجھے تم سے نفرت ہے۔ تمہارے گھروالوں سے نفرت ہے۔ سچ کہتا ہوں مجھے اس دن سے تم سے سخت نفرت ہے جب میں نے پہلی مرتبہ بچپن میں تم کو رخشندہ کے ساتھ ایک خاموہ کا سا برتاؤ کرتے دیکھا تھا۔“

وہ پھاٹک تک پہنچ گئے : ”اچھا اب اجازت ہے، خدا حافظ۔“
 وہ اپنی ڈراج میں بیٹھا اور وہ نہاٹے سے ڈھلوان پر سے اترتی ہوئی مکتیڈرل کے دوسری طرف جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اور پھر سبک پاپ اسی طرح بجاتا رہا۔ ہوانے درتچے کا پیٹ کھول دیا تھا۔
 شاہینہ نے اٹھ کر دوبارہ اسے بند کر دیا۔ باہر بارش کے پھلے قطروں سے
 بھیگی ہوئی سڑک دُور تک خاموش اور سنسان پڑی تھی۔ یہ اجنبی راستے
 نہ معلوم کیوں شروع ہوئے اور کہاں جا کر ختم ہوں گے ؟

لیکن گومتی بہتی رہی

نشاط محل ہوش کے ڈرائنگ روم میں پیا نو بہت مدہم سروں میں بچ رہا تھا۔ اوا ”پنکھر ٹیول“ کے لیے گربا کی مشق کر دتے کر دتے اچھی طرح تھک چکی تھی۔ سندھ کے کنا رے — اب توجیون مارے — اب توجیون مارے — اکتاہٹ کی انتہا۔ نشاط کا سارا اپر فلور بالکل خاموش تھا۔ نیچے صرف پیا نو بچ رہا تھا۔ یا مس لینڈ روم اپنے کمرے میں ٹائپ میں مصروف تھیں یا بارش کی ترچھی ترچھی مچھواریں اور ہوا کے ریلے گلی داؤدی کے پودوں کو جھکائے ڈال رہے تھے۔ اور پھر اسی وقت چیلپل کا سمجھاری سفید دروازہ آہستہ سے کھلا اور مادرِ مقدس کے مرمیوں میں روشن شمع کی کوہوا کے جھونکوں سے ایک ثنائیہ کے لیے بھڑکی اور بجھ گئی۔ لیکن تم ایسے دنیا جہاں سے بیزاریوں بیٹھے ہو — کہو خوب لکھ رہی ہو — خوب لکھ رہی ہو۔“

”یوں نہیں، واہ۔ مٹھیک سے تعریف کرو۔“

”مٹھیک سے تعریف کرتا ہوں۔ سبحان اللہ۔ اللہم زدو فرد۔ ان اللہ

مع الصابرین —“

”کتنے گدھے ہو واقعی۔ اب مجھے تم پر غصہ آجائے گا۔“

”یہ تو تم مجھے ایک لاکھ پندرہ ہزار مرتبہ بتا چکی ہو۔“

”جی چاہ رہا ہے اٹھا کے کھڑکی سے باہر پھینک دوں تمہیں۔ جانتے بھی

ہو کس قدر نفیس افسانہ لکھ رہی ہوں۔“

”جانتا ہوں وہی ہزاروں برس پرانی لغو داستان۔ ابھی چھپل کا دروازہ

کھلا ہے۔ یقیناً ہیروئن صاحبہ اس میں داخل ہوں گی۔ پھر آپ کچھ میڈ ذرا کی

تقدیس، مونا لیزا کے تبسم یا اسی قسم کی خرافات کا تذکرہ کریں گی کہ پڑھنے والے

بچارے مغرب ہو جائیں۔ اس کے بعد کچھ تحلیل نفسی ہوگی، کچھ چاندنی لہروں

کے سانہ پر ایک انگریزی گیت گایا جائے گا۔ ورنہ پھر اوپلے، مہینس، کلرک

— میل گاڑیاں — بنگال — زوروں پر آ رہا ہے غصہ۔ مگر یہ غصہ آنا بھی

تو بہت عام بات ہو چکی ہے۔ کوئی جدت پیدا کرو اپنی کہانی میں۔“

”تو کہاں سے لاؤں جدت؟ دنیا ہی اتنی پرانی اور گھسیٹی پیٹی ہے۔ جو کام

یا بات بھی شروع کروں وہ مجھ سے پہلے بچپن کر چڑھ چکی ہوگی۔ اب تمہارے

لیے جہان نو پیدا کیا جائے۔ بالکل نئے اداس نوکھے کردار اس میں آئیں۔“

”جہان نو۔ اداس۔ اس سے زیادہ پرانی بات اور کیا ہوگی۔ روزِ شام

کو بابر لوگ کافی ماؤس میں اکٹھے ہو کر ایک جہان نو پیدا کرنے کا ارادہ کرتے ہیں۔

بلکہ اس سلسلے میں تمہاری سلطانی آپا تو ایک بے انتہا بصیرت افزا مقالہ اپنی پی۔

ایچ۔ ڈی۔ کے لیے لکھ رہی ہیں کہ تعمیر بعد از جنگ —“

”چھو تو، ابھی اپنی اور یونیورسٹی کا مرنے پڑھ رہے تھے۔ تمہیں منطق

بالکل نہیں آتی۔“

”یہی تو کہہ رہا ہوں بھائی — یہ گومتی تو اسی طرح بہتی رہے گی۔ تمہارا نظام اور تمہارا ماحول تو چھینچھین کر کہہ رہا ہے کہ تم کتنا ہی اچھل کود و قہوے کی پیالیاں کی پیالیاں ختم کر ڈالو مگر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ اس پر یاد آیا کہ عسکری بلگرامی اور عزت کے انتقال پر تم لوگ کتنا کتنا روٹی تھیں۔ مائے اب جلوہ سوں میں ہماری قیادت کرنے کون آئے گا؟ اللہ ذکیہ کیا کرے گی بھاری؟ افوہ! عزت کا نتیجہ صرف ایک ہفتہ بعد نکلا۔ میڈیکل کالج کی برچیوں کی طرف تو دیکھا ہی نہیں جاتا۔ اب تو یہ — وہ — کیا — وہ شعر بھی تو موزوں کیا گیا تھا: غ تذکرہ عسکری مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ — اور اگلے سال ہی آپ سب کی سب ذکیہ کے عقد ثانی میں نہایت مستعدی سے تشریف لے گئیں اور —“

”یہ تم نے کیا ذکر چھیڑ دیا۔ یہی تو طریقہ اظہارِ غم کا ہوتا ہے۔ اور کیا کرتے؟“

جی ہاں۔ اب آپ شعلوں کو بڑے رومان اور افسردگی کے ساتھ ملاحظہ فرما رہی ہیں۔ گویا میں نے عسکری اور عزت کی یاد تازہ کر کے بربطِ دل کے تار لرزاں کر دیے۔ ارے کتنا بنتی ہو تم لوگ؟“

”آپ موضوع سے بہت دُور ہٹے جا رہے ہیں۔ میں افسانہ لکھ رہی ہوں۔“

اس وقت ارادہ ہے کہ کپڑے کھا جاؤں تمہیں سالم۔ ان رقصاں شعلوں کا عکس تمہارے —“

”جی، ہوش میں رہیے ذرا —“

”افوہ، تم لوگ۔“
 ”افوہ، تم لوگ۔“

”پرسوں شکنتلا سے کہا جا رہا تھا: ”اُدہ مس راجپال You were just wonderful last evening. اگر آپ نہ ہوتیں تو بس جانے کیا ہو جاتا۔
 یقیناً آپ حضرات انتقال فرما جاتے اور یونیورسٹی میں پورٹریٹ فارم یا گرام
 سدھار کا محکمہ قائم ہو جاتا۔) اور شکنتلا اس طرح مسکراتی ہے جیسے آپ کے
 قصیدے کے ایک ایک لفظ کو سچ سمجھ رہی ہے۔ اور اسی وقت حوٹا بانی سے التجا
 ہو رہی تھی: ”دیکھیے مس رحمن، معنی فیسٹو پر آپ کے دستخط تو بہت ہی ضروری
 ہیں۔ بلکہ علی سردار.....“

”اچھا تم افسانہ شروع کرو اپنا۔“

”ابھی دیا چہ ہو رہا ہے۔ چکے بیٹھے سنتے رہو۔ پٹی ہوئی زندگی میں کچھ
 مانہ گی اور ناوٹی کا تجربہ کرنے کے شوقین ہیں۔ لیکن یہ تم لوگوں کی ساری قوم کی قوم ہی۔“
 ”بھئی تم خود سنی کہہ رہی تھیں کہ فوٹی کہاں سے آئے۔ دنیا تو روز بروز
 زیادہ پرانی ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن رہنا تو اسی میں ہے۔ یو کلیٹس کے جھنڈ میں
 چھپا ہوا تمہارا کالج کا چیل اسی طرح ساکت اور بے حس کھڑا ہے۔ موتی محسوس
 برج کے اوپر سے اب تک نہ معلوم کتنے ایک دوسرے کے ساتھی ٹولیاں بنانا
 کر قبچھے لگاتے گزر چکے ہیں جواب ان ہی حالات میں داپس نہ آئیں گے۔ مگر اس
 اس کی تحریکوں کے نیچے ندی کا پانی ہمیشہ یوں ہی سکون سے لہراتا ہوا بہتا رہے گا۔
 سچ جج تمہاری یہ بیزاری اور افسردگی کی اد بھی اب اپنا نیا پس کچھ کچھ چوکی

ہے۔ تم ہر بات سے جلد کتا کر پریشان اور غمگین ہو جاتی ہو۔ دنیا میں زندہ رہنا سیکھو بی بی۔“

”بھئی اب اس فلسفے کو چھوڑو اپنے۔ میں کہانی لکھ رہی ہوں۔ تم کوئی اچھا سا عنوان سوچو اس کے لیے۔“

”ہیر وئن کون ہے؟“

”جو اب چھیل میں داخل ہونے والی تھی، یعنی ثریا۔“

”مگر ثریا بگڑ جائے گی۔“

”وہ بگڑے گی تو ہم اسے منالیں گے۔“

”اس ”ہم“ میں میں بھی شامل ہوں۔“

”جج قطعی نہیں۔ میں اپنی لکھنؤ کی زبان استعمال کر رہی ہوں۔“

”لکھنؤ۔ آپ صرف عنوان بتا دیجیے۔“

”گویا سا کام تو میں کروں اور نام آپ کا ہو۔ تم لڑکیاں۔۔۔۔۔“

”افو، ذرا اسی آپ سے مدد جو مانگی تو اتر آگئے۔ اب تک جتنے افسانے

میں نے لکھے ہیں وہ سب آپ ہی کے زیرِ تخیل۔“

”اوہو، آپ اور تخیلات۔ اے فلک کچھ رفتار تو کیسی کیسی زیادتیاں

دوا لکھتا ہے۔ ذرا بھڑھڑنا۔ میں ہنس لوں۔“

”اُتر آئے جاؤ۔ ہم تو لکھتے ہیں افسانہ۔ نیچے کھیت لکھیں گے۔ بلکہ مہنے

عنوان بھی منتخب کر لیا۔“

”خامسا اچھا ہے۔ زیادہ لطافت آمیز ترقی پسندی کی خواہش ہو تو یہ لو۔“

اور سڑک بنتی رہی — اور ریل چلتی رہی — اور گومتی بہتی رہی — اور
بارش ہوتی رہی — اور بالاسری بجتی رہی —
”خدا کی قسم - افوہ بھی!“

”دیا بچہ ختم - اور کوئی اور بچہ بسا عنوان بناؤ۔“

”اچھا چپ ہو جاؤ۔ دیکھو، ایک دنیا ہے چھوٹی سی، چمکتے سورج،
لہکتے سبزے اور تھکتی کلیوں کی بستی - یوکلپٹس اور انجیر کے درختوں سے گھری
ہوئی جس میں بڑے بڑے گل داؤدی کے گچھوں پر عنابی اور زرد پروں والی
تتلیاں ناچتی رہتی ہیں - بس جیسے بیٹھو دن کا نغمہ مسلسل جو مسز جارڈن اپنے
سر کو پیچھے کشنوں پر ڈال کر سینتھ کوڑھ کی طرف دیکھتی ہوئی بجاتی رہتی ہیں
اور جہاں لمبے لمبے کوریڈورز کے شفاف فرشوں پر سے رنگین پرچھائیاں مہنسی
اور قہقہوں کے شریلے شور کے ساتھ ادھر سے ادھر گزرتی رہتی ہیں اور پس منظر
میں آرگن کے پردوں سے ایک ملگوتی موسیقی بلند ہوتی رہتی ہے اور اس دنیا
کے کنارے بوٹ کلب کی ڈھلوان کے نیچے گومتی بہت سی پرانی کہانیاں سناتی
ہوئی چلی جا رہی ہے — رواں اور مترنم - اس دنیا کے باسی ہمیشہ ہنستے رہتے
ہیں - بہت بھولے، بہت معصوم اور بہت شیریں - ان کی ننھی مٹی مسرتیں
جن کا مقابلہ سارے جہان کی دولتیں نہیں کر سکتیں - ہفتے اور اتوار کی شام
کو ”کامریڈ ایکس“ یا ”بلڈ اینڈ سینڈ“ جیسا ایک اچھا سا فلم - یوانڈیا میں
ایک مختصر سی دلچسپ پارٹی - ریڈیو پر ”پنکھڑیوں“ کا ایک کامیاب پروگرام
اور اس کے ساتھ عشرت رحمانی صاحب کا مستقل سگریٹ، مسٹر شاہ کی آفیش

اور سعیدہ آیا کی مسکراہٹ۔ اور پھر یہ بے حد ہنگامہ خیز مصروفیات۔ اگست کنسرٹ کی گریڈ مہیرسل، یونین کا مشاعرہ، فرینڈز آؤری سوئٹ کا جلسہ، اورے شنکر یا کشور ساہو کا ایٹ ہوم، مس عزیزہ یا مس حاجی کے ساتھ میچ۔ انہیں زندگی کے بوجھ کو محسوس کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ اس دنیا کے باسی ہمیشہ ہنستے رہتے ہیں۔

”لیکن کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ آنسوؤں کے جگمگانے ہوئے قطرے ان کی آنکھوں میں ناچنے لگتے ہیں اور بے یقینوں کے نغمے اور گومتی کی لہریں اور کرلیٹھ کورٹ کی تتلیاں — ان سب پر ایک ٹھنڈا سا دھند لکا چھا جاتا ہے۔ اور اس دھند کے میں چھپی ہوئی یہ دنیا بڑی غمگین ہو جاتی ہے۔“ سنو! ایک دفعہ کیا ہوا۔ اسی گومتی کے اس پار سے، جہاں چاندنی میں گیت بہتے تھے اور موجوں میں رنگ بزمی روشنیاں ناچا کرتی تھیں، ایک سرمئی سی گھٹا اٹھی جو آہستہ آہستہ سارے آسمان پر چھا گئی۔ اور پھر آندھی آئی اور بارش کے ریلے میں گل داؤدی کی ٹہنیاں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں۔ اور امروہوں کے باغ میں چھپے ہوئے سفید اور ٹھنڈے چھپ کے اندر بادِ خداوند کے مجسمے پر کرنیں برساتی ہوئی سبز قندیل آہستہ آہستہ ہلنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ایک دل بھی اسی آہستگی سے دھڑکتا رہا۔“

وہ سوچ رہی تھی۔ سوچتے سوچتے تھک چکی تھی۔ بھئی ایسا کیوں ہوتا ہے آخر؟ یعنی کوئی بات بھی۔ ریشیل خاموشی سے چپکے چپکے التجا کر رہی تھی۔ ہولی میری مدر اوگوڈ۔ ہولی میری مدر اوگوڈ۔ ثریا نے

بھی آنکھیں بند کر لیں۔ ہولی میری خاور۔ خاور۔ خاور۔

خالہ بھئی! تم ہمارے کالج ڈسے کے ایٹ ہوم میں ضرور آنا۔ میں تمہارے
اور مرغی میجر بھاٹی کے لیے دعوت نامے بھجوا دوں گی۔ اچھا۔ پچھلے سال ہم نے
”کوالٹی اسٹریٹ“ کیا تھا۔ اس کی ہیروئن چندر لیکھا تو آج کل امریکہ میں ٹھاٹ
کر رہی ہے۔ اب کی دفعہ ہم ’لالہ رخ‘ ایکٹ کریں گے۔ اور معلوم ہے کل
ہم حے فیئر میں رام گوپال سے ملے تھے۔ بہت ہی ڈولینٹ آدمی ہے وہ۔
بہترین تلفظ اور لہجے میں انگریزی بولتا ہے۔ پچھلے ہفتے ہمارے کالج میں اسے
نہو کیا گیا تو اتنا sensation پھیلا لڑکیوں میں کہ کیا بتاؤں۔ لڑکیاں بھی بڑی
جلدی infatuated ہو جاتی ہیں۔

وہ بہت دیر تک اسی طرح سیڑھیوں پر بیٹھی اپنی دل چسپی کی باتیں کرتی
رہی تھی۔ یہ باتیں خاور کے لیے بالکل نئی اور انوکھی تھیں۔ شام ذرا خشک
ہوتی جا رہی تھی۔ جب چپرا اسی نے خاور کے نام کی سلیپ لاکر دی وہ
سیدھی کھیل کے میدان سے واپس آکر وہیں نکولس ہال کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔
اور خاور پریشان سا ہو گیا۔ نکولس نکولس ہال کے پورچ کے عظیم الشان
یونانی ستون، پام کے بھگے بھگے پتے، عنابی گلاب کی خوشبو سے بو بھل ہو اؤں
میں تیرتی ہوئی ”لیڈی آو اسپین آئی لوو“ کی ہریں۔ بارش کے چھینٹوں
سے دھلی ہوئی سیڑھیوں کے مرمیں پتھر سر دھتے۔ سرد اور بے حس۔ عنابی
گلاب کی گلیوں اور ”لیڈی آو اسپین“ کے نعروں میں گرمی تھی اور کیف، کیونکہ
وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھ رہا تھا۔

ہوا کا ایک جھونکا گل جہر کی ٹہنیوں کو ہلاتا ہوا نکل گیا اور دفعۃً شریا کو خیال آیا کہ بھوپھی اماں کی کوٹھی وہاں سے زیادہ دُور نہیں اور یہ بھی کہ فرخ اس کی بہترین دوست ہے۔ فرخ !

اس روز کہ سینتھ کورٹ پر تسکیاں رقص کر رہی تھیں۔ فرخ کا پرچہ آیا : ”شری اتم مس چاکو سے کہہ کر فوراً آ جاؤ۔ علی گڑھ سے پارے اور زرینہ آئی ہوئی ہیں۔ سلطانہ آیا اور اکرام بھائی بھی صبح ہی کانپور سے واپس آئے ہیں۔ لان پر مزے دار دھوپ پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں بیٹھ کر کیم اور برج رہے گا۔ بس تمہاری کمی ہے۔ خالہ بی کو فون کر دو، بڑا افسوس ہے کہ اس ویک اینڈ پر تم نہیں آ سکتیں کیونکہ فرخ نے بلایا ہے۔ کیا ہے، ہر سفتے تو تم جاتی رہتی ہو گھر۔ مسعود بھائی تمہارے قطعی انتقال نہ کر جائیں گے۔ یہ منگیتر لوگ واقعی کس قدر مصیبت ہوتے ہیں۔ خاور صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں مزے کی بات یہ ہے کہ یہاں آ کر ریسرچ کلاس میں داخلہ لیا ہے آپ نے۔ ذرا سوچو تو میری جان کے لیے مستقل مصیبت۔ اچھا تم ابھی آ جاؤ، فوراً۔ شام کو طلعت محمود کو بلایا ہے۔ اس سے وہی گیت سنیں گے، وہی پاگل کر دینے والا نغمہ : ”یہ وجہ کہ فصل بہار ہے۔“ تمہیں مرغی میجر بھائی سے بھی ملوائیں گے۔“

لیکن مسعود بھائی تو منگیتر ہونے کے باوجود مصیبت نہیں تھے۔ کبھی انہوں نے رومانٹک بننے کی کوشش نہیں کی حالانکہ یہ چچا زاد اور بھوپھی زاد قسم کے رشتے خواہ مخواہ کچھ افسانوی سا محسوس کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ یعنی لوگوں کی پست ذہنیت کی حد ہے نا کہ جہاں بھی لڑکوں اور لڑکیوں کا کسی طرح سے

بھی ایک ساتھ ذکر آیا اور فی الفور اوٹو میٹک طریقے سے افسانہ پیدا ہو جاتا ہے۔
توبہ اللہ میرے -

لیکن وہ فرخ کے یہاں گئی۔ اور خاور سے ملی۔ اور افسانہ تیار ہو گیا :
' یہ وجہ کہ فصل بہار ہے۔ '

وہاں برآمدے میں سب جمع تھے : مرغی میجر بھائی، خاور، کارمیڈ اکرام،
کمال۔ تم نے رنگ برنگے پردوں والی تیتریوں کو دیکھا ہے نا! جو سبز سے پر
فرگس کے پتوں پر چھبلا رہی ہیں۔ یہ تمہارے کسی فلسفے، کسی نظریے یا ایسی ہی کسی
تخیلی خرافات کی بہت زیادہ قائل نہیں۔ دنیا ان کے لیے ایک بہت بڑا سائینس
کورس ہے اور بس۔ جس پر ہم تم ان کے لیے گیندوں کی طرح لٹھکتے پھرتے ہیں۔
زندگی ذرا وسیع پیمانے پر حضرت گنج میں سے فیڈر یا بلوہیون کی ایک خاص شام
سمجھ لو۔ خاصیت ان کی یہ ہے کہ "اشتمالی اقدار"، "بودنڈو" ماحول کی تلخیاں
یا "پروٹساری ادب" کا کچھ ذکر کرو فی الفور معروب ہو جائیں گی۔ پکچر نہ چلنے کے
لیے معوکیا جائے گا۔ ریپورسٹ یا حضرت گنج سے واپسی پر کار میں لفٹ دیے
جائیں گے۔ پھر ایک نیا رکیٹ اور ایک نئی بال۔

کمال نے خاور سے تعارف کرایا۔

"آؤ، کس قدم مغالطہ فائدہ معلوم ہوتے ہیں یہ تمہارے کزن لوگ۔ حد
کی حد۔" پارے نے بیزارمی کے ساتھ کہا۔ لان پر بیٹھی ہوئی لڑکیاں برآمدے
کی باتیں سن سن کر جل رہی تھیں۔ اس وقت کچھ لدان کی موڈ ہے نہیں، ورنہ
تمہارے ان کمال بھائی کا دماغ ٹھیک کر دیا جاتا۔ خدا کی قسم۔"

کہاں صاحب کیا کچھ نہ تھے : ماہر و گلزار ، وجیبہ و شکیل ۔ اپنے
 اندازے کے مطابق جلو میں سینکڑوں ملاحتیں ، صباحتیں اور قیامتیں لیے
 ہوئے ، بالکل مشغولی بدرِ منیر و بے نظیر کا جدید اکسفورڈ پمفلٹ ۔ ریڈیو
 اسٹیشن پر ایک دن اوما سے ملے تو عرض کرنے لگے : ”اے مس شیرالے ۔ آپ
 کے تقریبات گھنٹروں کی جھنکار کی خراب ناک گونج سے ستارے جھللا اٹھے ۔
 شعلستانِ حیات کے مدھم اجالے میں ایجنڈا کی —“ اوما گھبرا گئی ۔ یہ اسی
 طرح بولتے جاویں گے اور مسجدہ آپا سمجھیں گی کہ ابھی رہبرِ سلِ ختم نہیں ہوئی ۔
 ثریا ، رفعت ، فرخ ، اوما ، ریشیل — سب سخت جلتی تھیں ان سے ۔ اپنی
 gallantry کا مظاہرہ کرنے کے لیے ہر جگہ موجود ہو جاتے تھے ۔ ہسٹری سوسائٹی
 کی ہفتہ وار میٹنگ ، کیسٹری کلب کا جلسہ ، نیولائف یونین کی پارٹی ، افوہ !
 اور پھر خاوند — بہت خاموش ، بہت سنجیدہ ، لڑکیوں کی موجودگی میں ذرا
 گھبرا جانے والا ۔ چائے کے وقت سب کا ایک دوسرے سے بہت پُر تکلف
 طریقے سے دوبارہ تعارف کرایا گیا ۔ تمہیں یاد ہے ثریا ؟ ہمارے دور کے
 رشتے کے ایک بھائی تھے جو دہرہ دوں میں چھٹیاں گزارنے ہمارے ہاں
 آیا کرتے تھے ۔ بچارے باتیں بہت کرتے تھے ۔ لیچیاں چرانے پر مالی سے
 پٹ بھی گئے تھے ۔ ایک دفعہ ہر بات میں دل چسپی لینے اور دخل دینے کو
 مستعد رہتے تھے ۔ بڑے ہو کر کپتان بننے کی شدید خواہش تھی ۔ ڈو کی
 میر کے سخت شوقین تھے ۔ ہمارے بھائیوں نے ان کے لیے ایک شعر
 بھی کہا تھا :

کر میا بہ بخشنائے بر حالِ ما
کہ مرعنی کا میجر تو حجبہ کو بنا

رفت کی بر قسمتی سے آپ انڈین پولیس کے مقابلے میں کامیاب ہو کر
یکایک بے حد قریبی عزیز ثابت کر دیے گئے وہیں اور کرسمس بسر کرنے کے
لیے انہیں الہ آباد سے پکڑ کر منگوا یا گیا ہے۔ ان سے ملو، یہ ہمارے مرعنی
میجر بھائی ہیں۔

د اخاء، آپ ہیں ثریا بیگم۔ آئیے، آئیے۔ فرخ اور رونی تو آپ کا
انتظار کر رہے ہیں۔ ثریا بیگم یہ کریم روز لیجے۔ ثریا بیگم سبزے پر چلے ہوئے
گل داؤدی کے گچھے کتنے حسین لگ رہے ہیں۔ ثریا بیگم آپ کا پسندیدہ سٹارک
روبرٹ ٹائٹل تو نہیں۔ ثریا بیگم۔

اُف یہ بچاری لڑکیاں، اور ستم ظریفی ملاحظہ کیجیے کہ آپ خود ہی نشانہ
بننے کا مکمل ذوق اور صلاحیت رکھتے ہیں اور تیر اندازوں سے احتجاج کیا جاتا
ہے کہ اگر آپ اس مشغلے سے باز آئیں تو دنیا میں امن قائم ہو جائے۔ رفت،
مرعنی میجر بھائی کی ہمیشہ قصیدہ سرائی کرتی رہتی تھی: ”ہمارے کزن، بحالہ آباد
میں ہیں، اس قدر مزے دار ہیں کہ کیا بتاؤں۔ گھڑاتے ہیں تو لگتا ہے کہ طوفان
آ گیا۔ ہر وقت تھپتھپ، ہنسی مذاق۔ کرکٹ بے حد عمدہ کھیلتے ہیں۔ گورنر ایون
میں رہ چکے ہیں۔ ورلڈ راولپکس میں فلیٹ لفیا گئے تھے۔ اس کے علاوہ بہترین
ترقی پسند ادیب ہیں۔ افسانوں کی تعریف میں ان کے پاس لڑکیوں کے اتنے خطوط
آتے ہیں کہ افوہ۔ اور ڈیننگ تو اس قدر ہیں بھئی۔ بس آل راونڈ میں بالکل۔“

مرغی میجر بھائی گویا قصہ مختصر کسی اپالو قسم کے یونانی دیوتا کا پنگوئن ایڈیشن تھے۔ اے میرے نیلے کنول کے دیوتا !

اس وقت ثریا کو سچ حج رونا آ گیا۔ اس تمھارے مرغی میجر بھائی نے کیوں بھیجا تجھے عید کا روڈ۔ کیا سمجھتے ہیں بیچنڈ۔ عید کی رات کو خالہ بی کے گھر سب جمع تھے۔ ثریا بہت دیر سے کوشش کر رہی تھی کہ طوفانی ندی کے اس ریلے کو روک سکے جو کہیں اس کے اندر ابل رہا تھا۔ وہ جی میں محض یہی سمجھتا تھا کہ اگر اپنے دوستوں کے ساتھ سائیکلوں پر دلکشا میں مون لائٹ پکنک منانے کے لیے جایا جاسکتا ہے تو۔ اوف۔ اللہ، اللہ میرے، ثریا ڈورینگ روم میں جا کر قالین پر منہ چھپا کر اتنا روئی کہ اس کا جی چاہا کہ سارے ٹب اور ساری بالٹیاں اس کے آنسوؤں سے بھر جائیں اور وہ روتی رہے۔ روتی رہے۔ خاموشی سے۔ یہ برداشت سے باہر تھا۔ برابر کے کمرے میں مرغی میجر نے کیا کہا تھا ابھی ابھی۔ وہ کمرہ قہقہوں کے شور سے اب بھی گونج رہا تھا۔ علی گڑھ سے رازہ بھائی آئے ہوئے تھے اور اٹھلا اٹھلا کر اپنی تازہ غزل سنا رہے تھے :

چلا ہوں انہیں قصہ غم سنانے
مرے ہوش شاید نہیں ہیں ٹھکانے

مرے ہوش شاید۔ اُف اللہ ! ان لوگوں کے سامنے اس کے لیے کہا گیا۔ اکرام بھائی اور فرخ اور یہ رازہ بھائی جنہوں نے اس کی definition کی تھی کہ اماں اس لڑکی میں شعریت کس قدر ہے۔ اُف شعریت کی دُم کہیں کے۔

اور پھر جانتے ہو نا یہ ہندوستانی بورڈر ٹوا کی ایک boring سی، بے معنی سی داستان ہے جس میں سماج کا کو ذالانہ جی اور طے شدہ بات ہے۔ لہذا جناب عالی ”سماج“ بڑے کٹھاٹھ سے عین موقعہ واردات پر کود پڑا۔

کیونکہ پھولوں کی اس رنگین وادی میں رہتی ہوئی تشریفانے تاریخی شگوفوں کے تبسم کی سی آہستگی سے کہا: ”آؤ۔“ یہ بھول کر کہ اس کی مری ہوئی فرانسیسی ماں کا ماضی کیا تھا اور یہ بھی کہ معصوم مسرتوں کی یہ ننھی سی بستی اگر اس سخت اور بے حس کردہ آب و گل سے ٹکرا گئی تو اس کا نتیجہ بہت زیادہ خوش گوار نہ ہوگا۔ اور خاوار کیا۔ یہ جانتے ہوئے کہ —

نیر۔ اور افسانہ ڈولپ منٹ کے تمام مدارج نہایت تیزی سے طے کر کے بہت جلد اینٹی کلائمکس پر اتر آیا۔ اور اینٹی کلائمکس قاعدے کے مطابق ہمیشہ بہت ہی بے مزہ اور ناخوش گوار سی ہوتی ہے۔

وہ دیر تک اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑی رہی۔ آدھی رات کی خنک سی ہوا کے جھڑکوں سے دروازوں اور درجیوں کے پردے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ سارا کیمپس سرد چاندنی میں ڈوبا خاموشی کے گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اسٹڈی ہال سے واپس آکر برابر کے پلنگ پر آکر بیٹھا سونے سے قبل کی دُعا میں مصروف تھی: اے ہمارے آسمانی باپ۔ تیری مرضی پوری ہو۔ تیری بادشاہت آئے۔!

تیری مرضی پوری ہو۔ اس نے سوچا کہ آسمانی بادشاہت کے دوازے تو اب شاید اس کے لیے ہمیشہ کے واسطے بند ہو جائیں گے۔ اسے ہنسی بھی آگئی کہ وہ

کیسی جذبہ باقی بن گئی ہے۔ پھر اسے اپنے اوپر دفعۃً غصہ آگیا۔ تم ہنس کیوں رہی ہو شریا بیگم؟ کیا تمہیں یقین ہے کہ تم صحیح الدماغی سے کام لے رہی ہو۔ صحیح الدماغی، افوہ! کتنا بڑا لفظ استعمال کیا ہے۔ تم بہت احمق ہو۔ لیکن، شریا بیگم، مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ اس سنبے چینی سے دیوار کی طرف کر دھک لے لی۔ تمہیں تو adventure کی تلاش تھی اور یہاں وہی پامال شدہ پتھر تھے واقعات شروع ہو گئے۔ چاندنی کا ایک ترچھا سارا مستہ قالین پر بن گیا۔ چاندیو کلپٹس کے جھنڈ پر سے تیرتا ہوا زنبہال ہوٹل کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ نیلے جاپانی داز کے برابر رکھا ہوا وینس ڈی میلو کا مجسمہ کزنوں میں جگمگا اٹھا۔ تم اس سفید تجسس کی طرح بے حس کیوں نہ رہیں؟ کیا ہو گیا تمہیں؟ حقیقت خوفناک طور پر واضح ہوتی چلی گئی۔ وہ کیا کرے؟ وہ کیا کرے۔ اللہ! صبح کے دھندلکے میں نینٹرن سروس میں شامل ہونے کے لیے ہاتھوں میں رنگین کاغذی قندیلیں اور لالی کے سفید پھول لیے کر مس کیرل گاتی ہوئی لڑکیاں سارے کالج کیمپس کا چکر لگا کر جیپل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ کر مس کا حمینہ شروع ہو چکا تھا جس میں خدا کے نقری پورل اور سرخ ہونٹوں والے فرشتے رحمتوں اور برکتوں کے خوبصورت تحفے لے کر نیلے آسمانوں سے نیچے اترتے ہیں۔ رحمتیں اور برکتیں! شریا اسی طرح بستر پر پڑی ہوئی تھی۔ رات بھر وہ سوچتی رہی اور جاگتی رہی۔ جاگتی رہی اور سوچتی رہی اور اب اس کے سر میں درد شروع ہو گیا تھا۔ ”بہترین نسخہ یہ ہے میرے یار کہ فی الفور کمیشن لے لو اور ٹکٹ کٹاؤ یہاں سے۔“ گوشتی کے کنارے آم کے سائے میں بندھی ہوئی ناؤ میں کمال صاحب بیٹھے

اپنی لذتیں رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ سر مہاراج سنگھ ابھی نہیں آئے تھے اس لیے ریس شروع ہونے میں دیر تھی۔ کنارے پر بوٹ کلب کے سالانہ Regatta کے ایٹ ہوم کے لیے زور شور سے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ واٹر پولو کے سجاوہین لڑکیوں کو نہایت بے نیازی کے ساتھ ایک نگاہ غلط انداز سے دیکھتے ہوئے عشق کے لیے پانی میں کود رہے تھے۔ شگفتا علی جعفر صاحب سے دماغ کھاتے کھاتے تھک گئی اور اپنی ناؤ میں آکر بیٹھ گئی تھی اور بے فکری سے پانی اچھال رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اکرام بھائیؒ کے پاس آگئے تھے: ”لو مس راجیال! کیسے آج کل کی تازہ ترین gossip کیا ہے؟“

شگفتا کا دل نہ چاہا کہ وہ ثریا کے متعلق اس قسم کی باتیں کرے۔ اکرام بھائیؒ کو مسکراتا دیکھ کر اسے نہ جانے کیوں ناقابل برداشت تکلیف ہوئی۔

”لیکن کامریڈ اکرام ثریا تو بہت sensible لڑکی تھی۔“

”جی ہاں، قطعی۔ آپ کو معلوم ہے حماقت اور عقل مندی کی حدیں بہت ہی اہم سیاسی مقامات پر ملتی ہیں۔“

اچھا چلے اور باتیں کریں۔ احمد علی دہلی سے آئے ہوئے ہیں، ان سے ملیے۔“

”مجھے نہ بھیجو مدمی کنارے۔“ ایک سخت نہایت تیزی سے لاڈو اسپیکر پر ریکارڈ بجنے لگے۔ فرخ کیمرو لیے ہوئے سر مہاراج سنگھ سے باتیں کر رہی تھی۔ صوفے کے پیچھے سے مسعود بھائیؒ گزرے۔ وہ بوٹ کلب کے کیپٹن تھے۔ انھوں نے فرخ کو دیکھا، جیسے کہہ رہے ہوں: ”فرخ بی بی جانتی ہو کیا ہو رہا ہے؟“

فرخ نے بے چینی سے کیمرو کا فیتہ اپنے ہاتھوں میں پٹینا شروع کر دیا اور اس نے چائسلر کی میز کی طرف جھک گئی، جیسے اس نے کہا کہ ”ہاں مسعود بھائیؒ میں

جانتی ہوں۔ سب جان گئے ہیں لیکن یقین کرنے کو تو جی نہیں چاہتا۔“
 خالہ بی نے صرف اتنا ہی کہا: ”اپنی اصلیت پر گئی۔“ اپنے بھائی کی
 موت کے بعد یہ دوسرا ناقابل بیان، ناقابل برداشت دھچکہ تھا جو انھیں اسی
 بھائی کی اکیلی لڑکی کی طرف سے پہنچا۔ اپنی اصلیت — پر — گئی۔ کس قدر
 خوفناک اور تلخ تھے یہ چار لفظ۔ جیسے کالج کی تمام علامتیں اپنے بھاری بھاری
 مستونوں اور چھتوں سمیت چاروں طرف سے ثریا پر گر پڑیں۔

سائنس بلاک کے پیچھے ”فورسٹ آؤ آؤن“ کے مپھلک کے (نڈر ریڈیو
 کی اسٹیشن دگین دیر تک مارن بجاتی رہی۔ رات کے دس بجے رفیع پیر کے ایک
 ڈرامے میں ثریا کا سب سے لمبا پارٹ تھا اور وہ نہ معلوم کہاں کھو گئی تھی۔ سعیدہ آپا
 نے جھنجھلا کر اسٹڈیو سے تیسری مرتبہ فون کیا: ”کیسی لا پر دار لڑکیاں ہیں، کبھی
 یاد نہیں رکھتیں کٹھیاک وقت پر ریہرسل کے لیے پہنچ جائیں۔“ آج تو ثریا کا گھر جانے
 کا بھی دن نہ تھا۔ ادما، رفعت، قمر، اندو۔ سب کو سخت کوفت ہو رہی تھی۔
 اسی ریہرسل کے مارے انھیں ”پوکلیٹ سو لجر“ miss کرنی پڑی۔ اور اب ثریا
 صاحب غائب ہو گئیں۔ چوتھی بار پھر فون آیا۔ یہ سعیدہ آپا کی آواز نہیں تھی۔
 حفیظ جاوید صاحب کی بھی نہیں۔ اور لڑکیوں میں سنسنی پھیل گئی۔ کیونکہ دوسرے
 سرے پر کرشن چندر صاحب بول رہے تھے۔ افوہ! کس قدر اکساٹ منٹ کی وجہ کی
 حد، یعنی ذرا خیال تو کرو مگر — کہ کرشن چندر کا تبادلہ لکھنؤ کا ہو گیا ہے اور آج کی
 تمثیل وہی پیش کریں گے۔ بھی نہ معلوم کیا ہو گا یہ افسانہ نگار۔ بے انتہا رومان
 آلود اور شعر آور سا۔ اسی قیامت خیز، روح افزا خبر کو سن کر ثریا پر شغلی بھی

فراہم کر دی گئی۔ لیکن ریڈیو اسٹیشن پہنچ کر بہت سی شدید قسم کا disappointment ہوا۔ خصوصاً جب یہ معلوم ہوا کہ —

”فدا رکنا ایک منٹ — بہت دلچسپ کہانی ہے لیکن اس نکتہ پر تم پر defamation کا مقدمہ چلایا جاسکتا ہے۔ اس پیرے کو قلمزدنہ کر دو۔ اس سے تمہارے پلاٹ پر کچھ اثر نہ پڑے گا۔“

”اے اللہ تم اتنی دیر سے چپکے بیٹھے تھے، اب پھر بیچ میں ٹپک پڑے۔“

”میں تو ایک قانونی مشورہ دے رہا تھا۔ خیر چلو آگے۔“

”اب بھی پتا نہیں میں کہاں تک پہنچی تھی۔“

”ہیروئن کہیں کھو گئی ہے، یعنی بھاگ گئی ہے اور بقیہ خواتین کو کرشن چندر کی طرف سے سخت disappointment ہوا ہے۔“ چلیے۔“

— سٹوڈیو نمبر ۳۵ میں گوہر سلطان ڈھونک پر گامہ ہی ہیں : ”امبوانٹے ڈولار کھدے مسافر، آئے پیاکے کہا روے۔“ اور نمبر ۱ میں مانک کے پاس اسٹول پر اپنے پارٹ پر نظر ثانی کرتے ہوئے دفعتاً رفعت کو ایک بد مزہ سا ناخوش گوار سا نیال آیا : زندگی آپ سے آپ مہلی سی کیوں بنتی جا رہی ہے — آخر؟ یعنی یہ کیا کٹر بٹر سٹر مہم ہے بھئی؟ اللہ کرے مرغی میجر بھائی کو ڈاکو پکڑے جائیں اور اکرام بھائی — اکرام بھائی قہقہے کی پیالی میں ڈوب کر خود کشی کر لیں — چنہ کہیں کے۔

دیوار میں سرخ روشنی جل اٹھی اور ریمبرسل شروع ہو گئی۔

پکچر نہ بے واپس پر مرغی میجر بھائی نے ذرا تنبیہ کیا اس سے کہا کہ یہ تم لوگ کیسے کیسے فضول فیچریوں اور لفٹنگوں سے ملنے لگی ہو تو رفعت کو بہت ہی بُرا لگا۔ اس

نے فراتیزی سے جواب دیا کہ اکرام بھائی 'قطعی فضول اور لپیچی اور لٹکے نہیں ہیں حالانکہ جس روز اکرام بھائی یہ کہتے ہوئے پائے گئے تھے کہ کامریڈ سلطانہ کی مہنوں میں سب سے زیادہ chic لڑکی رفعت ہے۔ باتیں کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے ستار پر ایمین کلیان کا لاپنج رہا ہے۔ ہنستی ہے تو کلیاں کھل جاتی ہیں۔ جنتا کی بے حد مہمزد ہے۔ ہر ہفتے قومی جنگ خریدتی ہے۔ وغیرہ— تو اس کے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی تھی کہ دونارہ بجاتی ہوئی جنگلوں کو نکل جائے۔ اس روز نیوانڈیا کافی ہاؤس میں یوم استالین گرامنہ کے سلسلہ میں ایک پارٹی تھی، جہاں سلطانہ آپا نے پہلی مرتبہ اس کا تعارف اس سے کرایا تھا۔ اور رفعت کے انسانہ کے مطابق وہ اعلیٰ درجے کے bore ثابت ہوئے تھے جن کی موجودگی یہ احساس دلاتی تھی کہ کہیں سے مارکھا کے یا چوری کر کے آئے ہیں اور اب کورٹ مارشل ہونے والا ہے۔ نہایت خزاں دیدہ، ستم رسیدہ، دنیا جہان سے بیزار۔ روس و چین میں مبتلا۔ شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پٹ کر آئے ہیں یا پٹ چلنے کا ارادہ رکھتے ہیں لیکن اس کے باوجود قومی جنگ کا پروپگینڈا کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اور اب— مرغی میجر بھائی نے حضرت گنج کے چوراہے پر کار کی برفنا رومی کر کے گیسرے لے ہوئے پھر کہا کہ تم نے کبھی فدا سنی عقل بھی استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تو اس نے ایک زبردست سی اونہ کی اور بارش کی پھوار سے بچنے کے لیے کھڑکیوں کے شیشے چڑھانے میں مصروف ہو گئی۔ ماوام حوا کی بیٹیوں نے ورثے میں کتنی بہت سی بیوقوفیاں حاصل کی ہیں۔ وہ جو آدم کے مغرور بیٹوں کا مذاق اڑانا چاہتی ہیں۔

• ایک آپا کی تقدیس مجسم ثریا صاحبہ ہیں جنہیں میں نے محض یوہی تفریحی عید

کارڈ بھیج دیا تو۔۔۔

”خدا کے لیے مرغی میجر مہائی خاموش رہیے۔“
بارش تیزی سے ہونے لگی۔

شدتِ احساس کا بوجھ دبائے ڈال رہا تھا۔ پھر بھی وہ سب خاموش تھے۔
کیا کہیں، کیا کریں؟ زندگی سے کچھ عجیب سی نفرت ہو چلی تھی!
بارش اسی طرح ہوتی رہی۔ پانی سے لدی ہوئی ہوا میں چیل کی بج بستی
سفید دیواروں سے ٹکراتی ہوئی نکل گئیں۔ مادرِ خداوند نے خاموشی سے کہا:
”افسوس میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکی۔“ اور انھوں نے اپنی بڑی بڑی معصوم
آنکھیں جھکالیں اور ان کا جھسمہ دھندلے میں ڈوب گیا۔

لیکن سجدہ آپا نے زیادہ خوبصورت الفاظ میں اس کو خدا حافظ کہا اور
جلد ملنے کی امید ظاہر کی اور لندن ہاؤس کے سامنے اسے اتار دیا۔ پھر ان کی
سُرمی بیوک چھینے لڑاتی ایٹ روڈ کی طرف مڑ گئی۔ لیکن اصلیت اتنی
خوبصورت نہ تھی۔ بارش سے پناہ لینے کے لیے جو امریکن اور گورے لندن ہاؤس
میں کھڑے سگریٹ کا بھگکا بھگکا دھواں اٹا رہے تھے ان کی سیٹیاں تیزی سے
اس کے کان میں گھس کر کہہ رہی تھیں: ”تھریا بیگم، مسز اس نے اپنے خط
میں تم سے درخواست کی ہے کہ تم مہربانی سے اپنے گھر چلی جاؤ۔“ (کیونکہ
فلسفے، عمرانیات اور اخلاقیات کی تمام موٹی موٹی کتابیں اپنے دماغ میں
ٹھونس لینے کے باوجود تم نے ایک ہی نہایت ناشائستہ حرکت کی ہے لہذا
تمہیں ایکسپن کر دیا گیا ہے، یعنی تمہیں کالج سے نکال دیا گیا ہے) پھر وہ

دیر تک دکانوں کے آگے کبے برآمدے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی رہی اور پھر تھک کر
 انڈیا کافی ہاؤس کے پہلو کے خالی زینے کی پختی میسر بھی پر بیٹھ گئی۔ کاش کاش!
 اچھا کاش تاں گہ ہی If wishes were horses beggars would ride.
 مل جائے۔ بس ایک سانگہ۔

”چاند باغ چلیے گا بابا؟ آئیے!“

حالانکہ اس سانگے والے کو، جو ابھی ابھی ایک امریکن کو کافی ہاؤس پر
 اتار کر اس کی طرف مڑا تھا، یہ معلوم نہ تھا کہ عام طور پر ایسی بھیگی ہوئی سی
 خاموش درپہر کے وقت چاند باغ کی بابا لوگ حضرت گنج نہیں ٹہلا کرتیں۔ اور پھر
 ہوا کے پھیٹر وں کے، ہرے سانگہ چاند باغ کی طرف بڑھنے لگا: آرٹ اینڈ
 گریفٹس ایمپوریم — لیڈلام — پلانڈا — نیو انڈیا کافی ہاؤس —
 مے فیئر — ہلویشیا کورٹ — فرینچ موٹرڈ — جہانگیر آباد پبلیس —
 موتی محل برج — یونیورسٹی — اور گھر — وہ گھر پہنچ گئی۔

لیکن گھر وہاں نہیں تھا۔ یعنی پچھپی اماں تبدیل آب و ہوا کے لیے
 دہرہ دوون چلی گئی تھیں۔ اختلاجِ قلب کی مریض تھیں۔ اور مسعود بھائی کو امپیریل
 ٹوبیکو میں نہ کری مل گئی تھی۔ دہاں سے تار آیا تھا اور وہ کلکتہ چلے گئے تھے۔ پچھپھا
 جان تو خیر ہمیشہ رہتے ہی دورے پر تھے۔

جاڑے کی مہاوٹیں تھیں، تیزی سے برس کر بہت جلد کھل گئیں اور بادل چھٹ
 جانے پر دھلا دھلا نیلا آسمان بہا کی آمد کا پیغام دینے لگا۔ چار باغ کے پلیٹ فارم
 نمبر پر ٹہل ٹہل کر چو کلیٹ کھاتی ہوئی رفعت یہ سوچ سوچ کر خوش ہو رہی

تھی کہ پھولوں کا موسم اب زیادہ دُور نہیں۔ دہرہ دون میں مالی نے اس کی کوٹھی کے باغ کی بہار کے لیے صفائی اُجھی سے شروع کر دی ہوگی۔ پھر مرغی میچ بھائی بھی آجائیں گے۔ پھر سب معاملہ ٹھیک ہے۔ فٹ — فٹ — بالکل — وہ بہت خوش تھی۔ وکیلر بک سٹال پر ”قومی جنگ“ کا تازہ پرچہ خرید کر پھر اُسے وہیں پٹختی آئی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ کامریڈ اکرام نے کامریڈ سلطانہ کے ساتھ شادی کر لی ہے اور دونوں جنگال کے دورے سے واپس آ کر ممبئی کی گاندھی جناح مصالحت کو کامیاب بنانے اور ہندوستانی کو آزاد کرنے کی لڑ میں۔ جزاک اللہ! رفعت نے اس پرچے کے بجائے اس جیسے کا ’فلم انڈیا‘ خرید لیا اور سوچنے لگی کہ سودا بُرا نہیں رہا۔

اور چار باغ جنگلشن کے شور و غل سے دود، باہر کی طرف، وہ چھوٹا سا پلیٹ فارم خاموشی اور دھند میں ڈوبا ہوا تھا جہاں سے رات کے اندھیرے میں فوجیوں کی ریلیں اپنی نامعلوم منزل کی طرف روانہ کی جاتی ہیں۔ اور اس پلیٹ فارم پر سے ایک ٹرین ابھی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی دور دھند کے میں کھو چکی تھی اور بجلی کے کھمبے کا سہارا لیے تین پنجابی سپاہی سگریٹ کا دھواں اڑا رہے تھے اور لایعنی باتیں کر کے یا اپنی پسند کا گیت گنگنا کر اس وقت کو کاٹنا چاہتے تھے جو انھیں اپنی ریل کے انتظار میں وہاں گزارنا تھا۔ ایک بنگالی فوجی مستری بھی وہاں آ بیٹھا تھا۔

یار! مگر ہمارے کیپٹن صاحب نے بھی غضب ہی کر دیا۔ دل توڑ دیا ظالم نے، ہائے ہائے۔“

”ہاں جی تو شادی شادی اس نے کیا کرنی تھی۔ یہ تو ان چھو کر یوں سے پوچھو

کہ اتنا پڑھ لکھ کر یوں بے وقوف بنتی ہیں۔“

”یَس، نگراستری کا مین بڑا ونڈر فل چیز ہے۔ چاہے کیسا ہی کالج یا ولایت پاس ہو جائے، چاہے بالکل اُن پڑھ، پر تم اس کا دل کابات نہیں سمجھ سکتا۔“

”اماں جاؤ بھی بالوجہی۔ یہاں تو یہ جانتے ہیں کہ یہ ہم کو اُٹو بنانے کی کوشش کرتی ہیں اور خود اُٹو بنتی ہیں۔“

”اور پھر آج کل ایک سے ایک کالج گرلیں ماری ماری پھرتی ہیں خود ہمارے کمانڈنگ صاحب ایک دفعہ —“

اور بہت دور، گومتی کے اس پار، نشاط ہوسٹل کے ڈائٹنگ روم میں اوما شیرا نے ناچتے ناچتے تھک کر گھنگرو اتار کر ایک طرف پھینک دیے اور خود صوفے پر گر گئی اور گرا کے گیت کی لہریں شام کے ستارے میں کھو گئیں —
سندھ کے کنارے — اب توجیوں ہمارے — اب توجیوں —

ستاروں سے آگے

کرتار سنگھ نے اونچی آواز میں ایک اور گیت شروع کر دیا۔ وہ بہت دیر سے وہی ایک ماہیا الپ رہا تھا جس کو سنتے سنتے جمیدہ کرتار سنگھ کی پینچ جیسی تانوں سے ، اس کی خوبصورت دائرہ جی سے ، ساری کائنات سے اب اس شدت کے ساتھ بیزار ہو چکی تھی کہ اسے خوف ہو چلا تھا کہیں وہ کچھ اس خواہ مخواہ کی نفرت و بیزاری کا اعلان نہ کر بیٹھے۔ اور کامریڈ کرتار ایسا سویت ہے فوراً برامں جائے گا۔ آج کے بیچ میں اگر وہ شامل نہ ہوتا تو باقی کے ساتھ تو اس قدر سنجیدگی کے ٹوڈ میں تھے کہ جمیدہ کو زندگی سے اکتا کر خود کشی کرنی پڑ جاتی۔ کرتار سنگھ گڈوگرام فون تک ساتھ اٹھالایا تھا۔ ملکہ پھولج کا ایک ریکارڈ تو کیپ ہی میں ٹوٹ چکا تھا ، لیکن خبر۔

جمیدہ اپنی سرخ کنارے والی ساری کے آئینل کوشانوں کے گرد بہت احتیاط سے لپیٹ کر ذرا اور اوپر کوہ کے بیٹھ گئی جیسے کامریڈ کرتار کے ماہیا کو بے حد دل چسپ سے سن رہی ہے۔ لیکن نہ معلوم کیسی الٹی پلٹی الجھی الجھی بے تکی باتیں اس وقت اس کے داغ میں گھسی آرہی تھیں۔ وہ ”جاگ سونہ عشق جاگ“ والا بیچارہ ریکارڈ شکستہ نے توڑ دیا۔

”افوہ بھئی۔“ بیل گاڑی کے ہچکڑوں سے اس کے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا اور ابھی کتنے بہت سے کام کرنے کو پڑے تھے۔ پورے گاؤں کے مہینے کے ٹیکے لگانے کو پڑے تھے۔ ”توبہ!“ کامریڈ صبیح الدین کے گھونگرے بیلوں کے سر کے نیچے رکھے ہوئے دواؤں کے کبس میں سے نکل کے دواؤں کی تیز بوسیدگی اس کے دماغ میں پہنچ رہی تھی اور اسے مستقل طور پر یاد دلائے جا رہی تھی کہ زندگی واقعی بہت ہی تلخ اور ناگوار ہے — ایک گھسا ہوا، بیکار اور ناتواں بیکار ڈجس میں سے سوئی کی کھٹیس لگتے ہی وہی مہم اور لڑائی ہوئی تانیں بلند ہو جاتی تھیں جو نغمے کی لہروں میں قید رہتے رہتے تھک چکی تھیں اگر اس بیکار ڈکو، جو مدتوں سے ریڈیو گرام کے نچلے خانے میں تازہ ترین البم کے نیچے دبائو تھا، زور سے زمین پر پٹخ دیا جاتا تو حمیدہ خوشی سے ناچ اٹھتی۔ کتنی بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو وہ چاہتی تھی کہ دنیا میں نہ ہوں میں تو کیسا مزہ رہتا — اور اس وقت

تو ایسا لگا جیسے سچ مجھ اس نے ”I dreamt I dwell in marble halls“ والے گھسے ہوئے ریکارڈ کو فرش پر پٹخ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور جھک کر اس کی کرچیں چپتے ہوئے اسے بہت ہی لطف آ رہا ہے۔ غنائی موزیک کے اس فرش پر، جس پر ایک دفعہ ایک ہلکے پھلکے فوکس ٹروٹ میں بیٹے ہوئے اس نے سوچا تھا کہ بس زندگی سمٹ سمٹا کے اس چمکیلی سطح، ان زرد پردوں کی روان آفریں سلوٹوں اور دیواروں میں سے جھانکتی ہوئی ان مہم برقی روشنیوں کے خواب آلود دھندلے میں سما گئی ہے، یہ تپش انگیز جاز یوہی بجاتا ہے گا، اندھیرے کونوں میں رکھے ہوئے سیاہی مائل سبز فرن کی ڈالیاں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں اسی طرح جھکے کھاتی رہیں گی اور ریڈیو گرام میں ہمیشہ پورے گاؤں کے نئے نئے ریکارڈ لگتے جائیں گے۔ یہ تھوڑا ہی

ممکن ہے کہ جو باتیں اسے قطعی پسند نہیں وہ پس ہوتی ہی چلی جائیں — ریکارڈ گھستے جائیں اور ٹوٹے جائیں —

— لیکن یہ ریکارڈوں کا کیا فلسفہ ہے آخر؟ حمیدہ کو ہنسی آگئی۔ اس نے جلدی سے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ وہ اس کے گانے پر ہنس رہی ہے۔

کامریڈ کرتار گائے جا رہا تھا۔ ”دس دس دس دس دھولنا.....“ اُف ! یہ پنجابی کے بعض الفاظ کس قدر بھونڈے ہوتے ہیں۔ حمیدہ ایک ہی طریقے سے بیٹھے بیٹھے تھک کے بانس کے سہارے آگے کی طرف جھک گئی۔ بہتی ہوئی ہوا میں اس کا سرخ اپنچی پھٹھٹھائے جا رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے چمپئی رنگ کی ساری بہت سوٹ کرتی ہے۔ اس کے ساتھ کے سب لڑکے کہا کرتے تھے کہ اگر اس کی آنکھیں ذرا اور سیاہ اور ہونٹ ذرا اور پتلے ہوتے تو ایشیائی حسن کا بہترین نمونہ بن جاتی۔ یہ لڑکے عورتوں کے حسن کے کتنے قدر دان ہوتے ہیں۔ یونیورسٹی میں ہر سال کس قدر چھان بین اور تفصیلات کے مکمل جائزے کے بعد لڑکیوں کو خطاب دیے جاتے تھے اور جب نوٹس بورڈ پر سالانہ کے اعزازات کی فہرست لگتی تھی تو لڑکیاں کیسی بے نیازی اور خفگی کا اظہار کرتی ہوتی اس کی طرف نظر کیے بغیر کوریڈور میں سے گزر جاتی تھیں۔ کم بخت سوچ سوچ کے کیسے مناسب نام ایجاد کرتے تھے: ”عسریخام کی رباعی“، ”دہرہ ایکسپریس“، ”بال آف فائٹر“، ”It's love I'm after“، ”نقوش چغتائی“، ”بلڈ بینک“۔

گاڑی دھپکے کھاتی چلی جا رہی تھی۔ ”کیا بچا ہوگا کامریڈ؟“

گاڑی کے پچھلے حصے میں سے منظور نے جمائی لے کر جتن دیر سے پوچھا۔
 ”سارے چار۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا۔“ جتن دیر
 اپنا چار خانہ کوٹ گاڑی بان کے پاس پرال پر بچھائے، کہنی پر سر رکھے چپ
 چاپ پڑا تھا۔ شکنتلا بھی شاید سونے لگی تھی حالانکہ وہ بہت دیر سے اس
 کوشش میں مصروف تھی کہ بس تاندوں کو دیکھتی رہے۔ وہ اپنے پیڑا اور
 نہ سکیڑتی لیکن پاس کی جگہ کا ریڈ کرتار نے گھیر رکھی تھی۔ شکنتلا بار بار خود کو
 یاد دلارہی تھی کہ اس کی آنکھوں میں اتنی سی بھی نیند نہیں گھسنی چاہیے۔ ذرا
 ویسی یعنی نامناسب سی بات ہے، لیکن دھیان کے کھیتوں اور گھنے باغوں کے
 اوپر سے آتی ہوئی ہوا میں کافی خنکی آچلی تھی اور ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے۔
 ”بس بس دے ڈھولنا۔“ اور اب کرتار سنگھ کا جی بے تحاشا چاہ رہا تھا کہ
 اپنا صاف تار کے ایک طرف ڈال دے اور سوا میں ہاتھ پھیلا کے ایک ایسی نوردار
 انگڑائی لے کہ اس کی ساری تھکن، کوفت اور درماندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کہیں
 کھو جائے یا صرف چند لمحوں کے لیے دوبارہ وہی انسان بن جائے جو کبھی جہلم کے
 سنہرے پانیوں میں چاند کو ملکورے کھاتا دیکھ کر امر جیت کے ساتھ شکر کی سو
 تانیں اڑایا کرتا تھا۔ یہ لمحے، جب کہ تاندوں کی بھگی بھگی چھاؤں میں بیل
 گاڑی کچی سڑک پر گھستی مہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی، اور جب کہ سارے
 ساتھیوں کے دلوں میں ایک بیمار سا احساس منڈلا رہا تھا کہ پارٹی میں کام
 کرنے کا اتنی جوش و خروش کب کا بچھ چکا ہے۔
 ہوا کا ایک بھاری سا جھونکا گاڑی کے اوپر سے گزر گیا اور صبح الیہ

اور جتندر کے بال ہوا میں اُڑنے لگے لیکن کرتار سنگھ لیڈیز کی موجودگی میں اپنا
صاف نہ کیسے اتارتا؟ اس نے ایک لمبا سانس لے کر دواؤں کے کبس پہ سر ٹیک دیا
اور ستاروں کو تکیے لگا۔ ایک دفعہ شکنڈا نے اس سے کہا تھا کہ کامریڈ تم اپنی
داڑھی کے باوجود کافی ڈیشنگ لگتے ہو اور یہ کہ اگر تم ایئر فورس میں چلے جاؤ
تو اسے بھی killing لگنے لگو۔

اُف یہ لڑکیاں!

کامریڈ سگریٹ لو۔ صبح الدین نے اپنا سگریٹس کا ڈبہ منظور کی طرف
پھینک دیا۔ جتندر اور منظور نے باجس کے اوپر جھک کے سگریٹس سلگائے اور پھر
اپنے اپنے خیالوں میں کھو گئے۔ صبح الدین ہمیشہ عبداللہ اور کریون اے پیاکر تھا۔
عبداللہ تو بلکہ اب ملتا بھی نہیں۔ صبح الدین ویسے بھی بہت سی رئیسانہ
خیالات کا مالک تھا۔ اس کا باپ تو ایک بہت بڑا تعلقہ دار تھا۔ اس کا نام
کتنا اسمارٹ اور خوبصورت تھا: صبح الدین احمد — محمدمزادہ راجہ
صبح الدین احمد خاں! افوہ! اس کے پاس دو بڑی بڑی چمکدار موٹر
تھیں۔ ایک مورس اور ایک ڈی۔ کے۔ ڈبلیو۔ لیکن کنگ جارجز سے
نکلے ہی آئی۔ ایم۔ ایس۔ میں جلنے کے بجائے وہ پارٹی کا ایک سرگرم ورکر
بن گیا تھا۔ حمیدہ ایسے آدمیوں کو بہت پسند کرتی تھی۔ آئیڈیل قسم کے۔
لیکن اگر صبح الدین اپنی مورس کے اسٹیرنگ پر ایک بانہ ورکھ کے اور
جھک کے اس سے کہتا کہ حمیدہ تجھے تمھاری سیاہ آنکھیں بہت اچھی لگتی
ہیں، بہت ہی زیادہ — تو وہ یقیناً اسے ایک زوردار تھپڑ رسید کرتی۔

”ہونہ۔ دیرز ایڈیٹس!“
صاحب کے رنگیں ملبے!

کرتار سنگھ خاموش تھا۔ سگریٹ کی گرمی نے منظور کی تھکن اور افسردگی ذرا دور کر دی تھی۔ ہوا میں زیادہ ٹھنڈک آ چلی تھی۔ جتنے نے اپنا چارخانہ کوٹ کندھوں پر ڈال لیا اور پرانی پرال میں ٹانگیں گھسادیں۔ منظور کو کھانسی اٹھنے لگی: ”کامریڈ تم کو اتنے زیادہ سگریٹ نہیں پینے چاہئیں۔“

شکستہ نے مہردی کے ساتھ کہا۔ منظور نے اپنے مخصوص انداز سے زبان پر سے تمباکو کی پتی ہٹائی اور سگریٹ کی راکھ نیچے جھٹک کر دور باجرے کی لہراتی ہوئی بالوں کے پرے افق کی سیاہ لکیر کو دیکھنے لگا۔ یہ لڑکیاں! طلعت کیسی نکومندی سے کہا کرتی تھی: ”منظور! تمہیں سردیوں بھر ٹانگ استعمال کرنے چاہئیں:

اسکائس ایمیشن یا ریڈیو مالٹ یا آسٹوماٹ — طلعت، ایرانی بلی! پہلی مرتبہ جب بوٹ کلب کے Regatta میں ملی تھی تو اس نے ”اوگوش! تو آپ جرنلسٹ ہیں — اور اوپر سے کمیونسٹ بھی — افوہ!“ اس اعزاز سے کہا تھا کہ ہیڈی

لیمار بھی رشک کرتی۔ پھر، آخری بار، جب خوابوں کی بستیاں بس کے ابڑ چکی تھیں، اس نے دور سے منظور کو مریں ستون کے پاس، پام کے پتوں کے نیچے بیٹھا دیکھ لیا تھا اور اس کی طرف آئی تھی — کتنی مہردی تھی وہ — یقیناً۔

اس نے پوچھا تھا:

”ہلو چائلڈ۔ یاؤ انڈل لفٹ؟“

”Ask me another.“ منظور نے کہا تھا۔

”اللہ! لیکن یہ تم سب کو آخر کیا ہو گیا ہے۔“ فکر یہاں کھائے جا رہی ہے۔
 مرے جا رہے ہیں۔ سچ جج تمہارے چہروں پر تو نحوست ٹپکنے لگی ہے۔ کہاں
 کا پروگرام ہے؟ مسوری چلتے ہو؟ پُر لطف سیزن رہے گا اب کی دفعہ۔ بنگال؟
 ارے ہاں، بنگال۔ ٹھیک تو ہے۔ ہاں میری بہترین خواہشیں اور دعائیں تمہارے
 ساتھ ہیں۔ کچن نہ چلو گے؟ ”جین آئر“ اس قدر غضب کی ہے گونش! پھر
 وہ چلی گئی۔ پیچھے کافی کی مشین کا ہلکا ہلکا شور اسی طرح جاری رہا اور دیواروں
 کی سبز رنگینی سطح پر آنے جانے والوں کی پرچھائیاں رقص کرتی رہیں اور پھر کلکتے
 آنے سے ایک روز قبل منظور نے سنا کہ وہ اصغر سے کہہ رہی تھی: ”ہونڈ۔ منظور؟“
 صبح الدین ہلکے ہلکے گنگنا رہا تھا: کہو تو ستاروں کی شمعیں جُجا دیں، ستاروں
 کی شمعیں جُجا دیں۔ یقیناً! بس کہنے کی دیر ہے۔ حمیدہ کے ہونٹوں پر ایک
 تلمیح سی مسکراہٹ بکھر کے رہ گئی۔ دُور دریا کے پل پر سے گھر گھر آتی ہوئی ٹرین
 گزر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ روشنیوں کا عکس پانی میں ناچتا رہا، جیسے
 ایک بلوری میز پر رکھے ہوئے چاندی کے شمع دان جگمگا اٹھیں۔ چاندی کے
 شمع دان اور انگوروں کی بیل سے چھپی ہوئی بالکونی، آئس کریم کے پیالے ایک
 دوسرے سے ٹکرا رہے تھے اور برقی پنکھے تیزی سے چل رہے تھے۔ پیا نو پر بیٹھی
 ہوئی وہ اپنے آپ کو کسی طریقہ کی ہیروئن سمجھنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ ”Little“

Sir Echo how do you do? hello, hello, wont you come
 over and dance with me
 رابرٹ ہائیر کے انداز سے کہتا تھا: ”حمیدہ تمہاری یہ سیاہ آنکھیں مجھے بہت

پند ہیں — بہت ہی زیادہ۔“ یہ ”بہت ہی زیادہ“ حمیدہ کے لیے کیا نہ تھا؟ اور جب وہ سیدھی سڑک پر سینا لیس کی رفت ر سے کار چھوڑ کر وہی ”I dreamt I dwell in marble halls“ گانا شروع کر دیتا تو حمیدہ

کو یہ سوچ کر کتنی خوشی ہوتی اور کچھ فخر سا محسوس ہوتا کہ رانے کی ماں موزارٹ کی ہم وطن ہے — آسٹریا۔ اس کی نیلی پھلکتی ہوئی آنکھیں، اس کے نارنجی بال — اُف اللہ! اور کسی گھنے ناشپاتی کے درخت کے سائے میں کار بٹھر جاتی اور حمیدہ جام کا ڈبہ کھولتے ہوئے سوچتی کہ بس میں بسکٹوں پر جام نگاتی رہوں گی۔ دانی انھیں کُترتا رہے گا۔ اس کی بیوک سینا لیس کی رفتار پر چلتی جلے گی اور یہ چناروں سے گھری ہوئی سڑک کبھی ختم نہ ہوگی۔

لیکن ستاروں کی شمعیں آپ سے آپ ہی بجھ گئیں۔ اندھیرا چھا گیا اور اندھیرے میں بیل گاڑی کی لالٹین کی بیمار روشنی ٹمٹما رہی تھی۔

ہو لا لا لا — دور کسی کھیت کے کنارے ایک کمزور سے کسان نے اپنی پوری طاقت سے چڑیوں کو ڈرانے کے لیے ہانک نکالی۔ گاڑی بان اپنے مرل بیلوں کی دھیمے مڑو مڑو کر انھیں گالیاں دے رہا تھا اور منظور کی کھانسی اب تک نہ رکی تھی۔

حمیدہ نے اوپر دیکھا۔ شبنم آلود دھندلے میں چھپے ہوئے افق پر ہلکی ہلکی سفیدی پھیلنی شروع ہو گئی تھی کہیں دور کی مسجد میں سے اذان کی تھرائی ہوئی صدا بلند ہو رہی تھی۔ حمیدہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور غیر ارادی طور پر آنکھل آنکھل سے سر ڈھک لیا۔

جتنے اپنے چار بھائیوں کوٹ کا تکیہ بنائے شاید لیٹیں کو اڑاؤ اور سو سو کے خواب دیکھ رہا تھا۔ مائیرا، ڈونا مائیرا۔ حمیدہ کی ساری کے انچل کی سرخ دھاریاں اس کی نیم وا آنکھوں کے سامنے لہرا رہی تھیں۔ یہ سرخیاں، یہ تپتے ہوئے مہیب شعلے، جن کی جلتی ہوئی تیز روشنی آنکھوں میں گھس جاتی تھی اور جن کے لرزے کپکپاتے سایوں کے پس منظر میں گرم گرم راکھ کے ڈھیر رات کے اڑتے ہوئے سناتے ہیں اس کے دل کو اپنے بوجھ سے دبائے ڈال رہے تھے۔ مائیرا، اس کے نفرتی تپتے، اس کا گتار، اکھڑی ہوئی ریل کی پٹریاں اور ٹوٹے ہوئے کبھے۔ سناٹا کلاوڈ کا وہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن جس کے خوبصورت پلیٹ فارم پر ایک اتوار کو اس نے سرخ اور زرد گلاب کے پھول خریدے تھے۔ وہ لطیف سا، رنگین سا سکون جو اسے مائیرا کے تاریخی بالوں کے ڈھیر میں ان سرخ شکوفوں کو دیکھ کے حاصل ہوتا تھا۔

وہ تھک کے گتار سبزے پر ایک طرف پھینک دیتی تھی اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ ساری کائنات سرخ گلاب اور ستارہ ہائے سحری کی کیلیوں کا ایک بڑا سا ڈھیر ہے۔ لیکن تاکستانوں میں گھرے ہوئے اس ریلوے اسٹیشن کے پرچے اڑ گئے اور طیاروں کی گڑگڑاہٹ اور طیارہ شکن توپوں کی گرج میں شور بٹ کے — “Rose — monde” کی لہریں اور گتار کی رسیلی گونج کہیں بہت دور فیٹ اوٹ ہو گئی اور حمیدہ کا انچل صبح کی ٹھنڈی ہوا میں پھٹپھٹا تا رہا، اس سرخ پرچم کی طرح جسے بلند رکھنے کے لیے جدوجہد اور کش مکش کرتے کرتے وہ تھک چکا تھا، اکتا چکا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

”سنگریٹ لوکھی۔“ صلیح الدین نے منظور کو آواز دی۔

”اب کیا بچ گیا ہوگا؟“ شکنتلا بہت دیر سے زیر لب بھیروکا ”جاکو موہن

پیارے“ گنگنا رہی تھی۔

حمیدہ سڑک کی رکیھا میں گن رہی تھی اور کرتار سنگھ سوچ رہا تھا کہ ”وس

وس دے ڈھولنا“ پھر سے شروع کر دے۔

گاؤں ابھی بہت دور تھا۔

آہ اے دوست

غم روزگار کو بھلا دینے کے لیے آؤ اور بج اسکو لیش پیس۔ کچھ طلسماتی خوابوں کی باتیں کریں۔ تم یونہی بیٹھے بیوقوف بننے رہو تو مجھے زیادہ اچھے لگو گے۔ بڑا اچھا مشغلہ ہے۔ ان سبز پردوں کی دوسری طرف انگور کی سیلوں سے ڈھکے ہوئے برآمدے میں جہاد یو جی اپنی کلاس لے رہے ہیں۔ ایک دو تین۔ چھن چھن چھن۔ کلاسیکل رقص دیکھو گے؟ خداؤں کا اپنا محبوب شغل۔ جگمگاتے تاروں کے پرے، ہمالیہ کی بلندیوں پر رہنے والے حسین خداؤں کے کھیل مہبت پر لطف اور انوکھے ہوتے ہیں۔ برج بایسوں میں شام، برج بایسوں میں شام، بھسری بجائے جا۔ بجائے۔ واللہ۔ کیا کیا نغمیں لکھتی ہے، تم لوگوں کی قوم۔ بیٹھے بیٹھے جا رہے ہیں وہی پرانی باتیں۔ سیلوں کا ناچ دیکھو گے؟ وہ سانسے دیوار کی روپہلی سطح پر ناربجی اور قمر زئی دھبے اندھیرے میں پھیلے جا رہے ہیں۔ یہ دریا میں ڈوبتے سورج کی کرنوں کا الوداعی رقص ہے۔ کاش تم سدھیر یا ادیا یا ایا کرہوتے۔ ہائے جمالیاتی حسن کا فقدان اور بد ذوقی کی فراوانی۔ کیا کروں، کہاں جاؤں بچاری

پس؟

ایک دو۔ ایک دو۔ تال کھروا۔ جہنا کنا رہے راما، جہنا کنا رہے راما ناچیں

عمر رنگ بالا۔ ٹٹ ٹٹ۔ چپ دیوتاؤں کی لڑکیاں جسنا کنارے ناچ رہی ہیں۔ تم
 مہادیو جی سے ملے۔ مانی پور کی ہری ہری وادیوں کے اپنے بیٹے۔ کہتے ہیں زندگی
 ایک رقص مسلسل ہے۔ فکر کا ہے کی۔ چھن چھن۔ تیز کر لے۔ مہادیو بر من
 مہاراج اصل فن کار ہیں۔ ہندوستان کے فن کار۔ ٹٹ ٹٹ۔ شانتی مکیتن میں
 ملازم تھے۔ گورو دیو کی موت کے بعد دادا نے الموڑے بلالیا اور اب تو کلچر سنٹر بھی
 ختم ہو گیا ہے۔ کاش کہ اپنے دیس واپس جاسکتے۔ پر کوئی فکر نہیں۔ ناچے جاؤ مگر
 رنگ بالا۔ دادا اور املا دیہی اگر ہندوستان کی بجائے روس یا امریکہ میں پیدا ہو گئے
 ہوتے تو کیا ہوتا؟ فضول کی باتیں۔ مائے الموڑے کے پھولوں سے بھری گھاٹیاں۔
 کاٹھ گودام سے جب موٹر بن کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی ہے اور یو کلیٹس کے جھنڈوں
 سے چھنتی ہوئی ہوا میں سانسے آکر ٹکرا جاتی ہیں توجی چاہتا ہے کہ۔ ہش۔ جی کا
 اس کے علاوہ اور معقول کام ہی کیا ہے کہ بس دیکھا ہی کرے اس کو، اس کو فحش۔
 دادا کہا کرتے تھے کہ ہمارے ملک میں جو فنون لطیفہ کی مٹی.... لاجول دلاقوہ۔ یہ
 کیا فنون اور لطیفہ اور گر بڑ بڑ بڑ لے بیٹھے۔ مہادیو جی آپ ناچے جائے۔ بڑی
 نالائق لڑکیاں ہیں۔ ایک ہفتے سے اسی ایک دھن سے آگے نہیں بڑھتیں۔ جی
 ہاں یہ سیزنل ڈانس ہے۔ پھر اس کے بعد ہاروسٹ ڈانس آپ کو دکھایا جائے گا۔
 پھر فوک ڈانس یا ہندوستان کی پیاری پیاری محسوم بیٹیاں، دھان کے کھیتوں
 اور پہاڑیوں کی وادیوں اور ندی کے کنارے اور آم کے باغوں کی زمیں پر چھائیاں۔

اٹریا پر چور بھائی، دیا جلاؤ۔ Put out the blue light sweetie pie.

پاروتی کے اسٹیج پر آنے سے پہلے ایک دم مدھم سا زور داندھیرا کر دو، effect زیادہ

نہ بصورت رہے گا۔ مسٹر ولینڈ خود ڈیڈی سے کہہ رہے تھے کہ آپ کی بچیوں کی مدد کے بغیر ہمارا جنگی ہفتہ اس قدر کامیاب نہ ہو پاتا۔ ہم سب اتحادیوں کی فتح کے لیے کوشاں ہیں۔ Do your bit please۔ چھنا نن نن۔ چھن چھن چھن۔ زندگی ایک نغمہ پیہم ہے، ایک رقص مسلسل۔ مہادیو جی آپ نے ہندوستانی کی مشرقی سرزمین میں جنم لیا ہے اسی لیے ایسے شاعرانہ طریقے سے سوچتے ہیں۔ آپ برہم پتر کی ملا دیوں کے لوگ ہر معمولی سے معمولی بات کو لطافت اور خوبصورتی سے ادا کرنے کے قائل ہیں۔ زندگی آپ کے لیے جل ترنگ ہے۔ دنیا کے نفرتی تاروں میں سے اٹھتی ہوئی ایمین کلیان کی راگنی۔ یہی باتیں آپ اس طرف کے لوگوں سے کہیں تو ایک زوردار تہقہ پر سے دنیا ان کے لیے بوگنگ رنگ ہے یا گرد سری شاپ یا پھر کچھ بھی نہیں۔ بہت ہی matter of fact قسم کے لوگ ہیں ہم۔ آپ کسی لڑکی کی تعریف کریں گے تو کہیے گا : کماری تم چاندنی میں تیرتے ہوئے کنول کا خواب ہو۔ پاروتی کے مرمریں قدموں پر لرزاں دیپک کی جھللاتی روشنی۔ میرے ساتھ گنگا کے دھارے پر ناؤ۔ افوہ! سیدھے سادے طریقے پر کہہ دیجیے کہ ! look here ! تم مجھے بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔ میرے ساتھ شادی کر لیا آج شام کو رومشن آگیا یا پھر زہلی چلا۔ ایک دو تین چھن۔

— آئی ڈی سائیں کے مندر میں دیا بار آؤں کر آؤں سولہ سنگھار۔ مسکی دیدی ناچتی تھیں تو ایسا لگتا تھا، یعنی غیر۔ مہادیو جی آپ ناچے جائیے۔ اور اس زندگی میں کیا رکھا ہے؟ سب ہی ناچتے ہیں اپنی اپنی جگہ۔ مسکی دیدی کلچر سنٹر کے کلاس روم میں اور حضور وائسرائے بہادر وائسرائے لاج کے بار روم

کی فلم پر یہ اور رنگ برنگے چھوٹوں والے کپڑوں میں ملبوس پناہ گزین پولش بچے
کا کھٹیاواڑ کی سمندری ریتوں پر — اور — اور — اچھا۔

لیمپ کی روشنی ذرا کم کر دو۔ مالکوس کی لہریں ضرورت سے زیادہ نرم
ہو رہی ہیں۔ سا بچہ بھی گھڑا۔ ہنسے جاؤ۔ مجھے تمھاری مسکراہٹ بہت
پسند ہے۔ یہ روشنیاں کبھی تیز ہو جاتی ہیں کبھی مدھم۔ یہی تو سارا فلسفہ ہے بھی۔
الموڑے کی چوٹیوں پر مال کے ققمے جگمگاتے ہیں اور نیچے وادی میں رقص ہوتا رہتا
ہے یا سلام مچھلی شہری کی نظم پڑھی جاتی ہے۔

الموڑہ۔ یعنی تال۔ مسوری۔ ہائے مسوری۔ ہائے دہرہ دون۔ میرا پارا
بچپن کا رفیق دہرہ دون۔ گڈو، ان کے بغیر ہندوستان، تمھارے گرم اور
پھلے ملک میں رہنا ایک مستقل مصیبت ہو جاتی۔ اللہ بڑا احسان ہے۔ بڑا اونچا
اور عمدہ۔ کیمینس بیک روڈ پر ایک ہز بلی ٹنس کی چمکدار تمغلیں رکشا کس قدر
خوبصورتی سے بہتی چلی آرہی ہے۔ اب تم مارکس اور لینن کا وظیفہ شروع کر دو۔ یہ
تم ہندوستانی۔ قنوطیت پسندی تو تمہیں لے ڈوبی۔ کبھی یہ غور نہیں کرتے کہ
ہماری aristocracy کس قدر شاندار اور خوبصورت ہے۔ پرنس کرم جیت
اور شہزادی نیلو فرادر جہاں راج پیلہ اور بیگم گوہر تاج اور مہارانی کوچ بہار
— ایک خاص زمانہ ہے ان ناموں میں۔ فٹس میورلی ناکولس۔ ان کے غیر
ملکی سکریٹریوں سے ملو، ان کو رنگ میں اسکیٹنگ کرتے دیکھو۔ ان کے بال
روم، سوائے کے کمرے، لیس کورس، وہ ڈائننگ ہال جہاں میزوں پر
چھوٹی چھوٹی برقی ٹرینوں کے ذریعے کھانا سروس کیا جاتا ہے، آسٹریلین گھوڑے

اسکاچ کتے۔

کم از کم تم نے میرے کتے کی تو آج تک تکلفاً بھی ذرا سی تعریف نہیں کی۔
کیسی ایک خاص شاعرانہ انداز سے چاکلیٹ ملنے پر دم ہلاتا ہے۔ دن بھر کھیلے
برادے کے کونے میں اپنی ٹوکری کے گدووں میں سمٹا سمٹایا غور و فکر میں محو رہتا
ہے یا کبھی کبھی محض ازراہ اخلاق ایک آنکھ کھول کر نرمی سے بھونک دیتا ہے۔
تم سے پہر حال زندگی کے متعلق اس کا نظریہ زیادہ صحت مند ہے۔

ہائے دہرہ دون۔ گرمیاں آکر ہی ہیں، یعنی کیلے اور فالسے کے جھنڈوں
میں بھنورے گونجنا شروع کر دیں گے۔ ہائے یو۔ پی۔ میرا اپنا پیارا یو۔ پی۔
تم نے کبھی یو۔ پی۔ کی گرمیاں نہیں دیکھیں۔ امم کے باغوں میں دوپہر کے سناٹے
کی خاموش موسیقی کا بوجھ محسوس نہیں کیا۔ امردوں کے جھڑپ میں سے بلند ہوتی
ہوئی بڑا اور آکھا اودل کی ٹنائیں نہیں سنیں۔ شاید کبھی طبع آباد جاگڑا م بھی
نہیں کھائے۔ اور گومتی کے خبر بوزے۔ آہ میرا اودھ۔ قیصر بلخ کی بارہ درمی میں
اندر سجھا ہو رہی ہے۔ میں سبز برہی۔ نہیں کھول لو آنکھیں۔ پیچھے دیکھنے کے بجائے
آگے دیکھنا صحت کے لیے مفید ہے۔

— تمہاری حزنیت دہی لفظ ہے ناشاید (یعنی بھی کبھی تو زندگی کو

خوش گوار رنگوں میں دیکھنے کی کوشش کیا کرو۔ مثلاً۔ مثلاً میرین ڈرائیو۔ جم ہو۔
مالا باہل۔ ورسوا۔ گہرے نیلے سندرمیں ڈوبتی ہوئی قمری شفق اور اودے
آسمانوں میں تیرتا ہوا نارنجی چاند، بڑے سے، رکیلے سے سفرے جیسا۔ تاج کا
پرنگالی آرکیسٹرایا پھر عشق کے تیز سرخ گلاب۔ بغداد کے زلمین شگوفوں سے بھرے

ہوئے چھوٹے چھوٹے صحن۔ تمہیں معلوم نہیں مجھے زندگی سے کتنا بے انتہا عشق ہے۔
 تم نے طہران کے امیروں کی اونچی اونچی دیواروں والی محل سراہیں اور ان کے اندر
 کے وہ باغ نہیں دیکھے جن میں چھوٹی چھوٹی ہزیریں بے حد الف لیلوی انداز
 سے بہتی رہتی ہیں اور جہاں سیاہ فرا کوں میں بلبوس لمبی لمبی پلکوں والی خانمیں
 ایک دوسرے سے نرم نرم اس طرح باتیں کرتی ہیں جیسے قہوے کی پیالیوں میں نقرئی
 چنچل سے شکر گھولی جا رہی ہو۔ افوہ! مجھے بغداد، طہران اور ٹاہرہ کی یاد مت
 دلاؤ، ورنہ اس روکھے پھیکے ملک اور اس تنگ اور بد مزہ ماحول سے اڑ جانے کو
 جی چاہے گا۔ گزرے خوابوں کو یاد کر کے ایک کونے میں جگہ دینے کا ایک بڑا فائدہ یہ
 ہے کہ یہ بہت حد تک compensation کا کام دیتے ہیں۔ ارے! تو گویا قنوطیت
 پسندی بھی الٹا فیشن ایل بلیغتی جا رہی ہے؟

اچھے گیت بھی تو اس وقت نہیں بچ رہے۔ سحاب کو خط لکھنا پڑے گا۔ گریسی
 فیلڈ کا کوئی نیاریکارڈ لگاؤں۔ اچھا تو تمہیں مغربی موسیقی سے دلچسپی نہیں۔ بد مذاق۔
 تو اب کیا باتیں کریں۔ علی گڑھ۔ میرس روڈ۔ سیاہ بُرقعے۔ نقوی پارک۔ گروز کالج کی
 لاری۔ وایا میڈیا۔ اسٹیشن۔ ڈاکٹر ضیاء الدین۔ نہیں کچھ اور سوچو۔ احمد عباس
 کی تازہ کتاب؟ یا The Brave New World۔ نہیں بھئی۔ بہت زیادہ
 boring ہوتی جا رہی ہے دنیا۔ چلداریکہ آرٹ چلیں۔ نیلی آنکھیں جانتی ہو میری
 کمزوری میں، یعنی ویک پوائنٹ۔ میلون ٹگلنس نے روشن آرمیں میلیں کے ساتھ رقص
 بھی کیا تھا اور اسٹال پر پوے ساڑھے چار منٹ تک تجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ افوہ!
 فدا خیال تو کرو، یہ کہہ رہا تھا: ”مالی ووڈ آؤ۔ ہم ہندوستان اور امریکہ کا کلچرل

اور دوستانہ رشتہ نہ یا وہ مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ ”میلون ڈگلز نے کہے یہ الفاظ“
 او۔

خیر تم کم از کم جیمس فورڈ یا روشن آرا کے ممبر بن جاؤ۔ تمھاری تندرستی بہت
 عمدہ ہو جائے گی۔ یا پھر گاجر کھاؤ۔ ٹماٹر بھی فائدہ مند ہوں گے۔ حیاتین کی کمی سے
 انسان کمیونسٹ بن جاتا ہے اور انہی حیات پر گفتگو کرنے لگتے ہیں۔ میں اتنی دیر سے
 کس قدر بصیرت افزا گفتگو کر رہی ہوں۔ بڑی بڑی گہرائیاں ہیں اس حیاتِ مستعار
 میں جنابِ عالی۔ وہ تو یہ سمجھو کہ کیا کیا فلسفے ہیں۔ افرو، کیا ٹھکانا ہے میری قابلیت
 کا۔ بہت قابل ہوں۔ چین اور روس اور فرائنڈ پر ساری کتابیں پڑھ چکی ہوں،
 گو یہ معلوم نہیں کہ ان کتابوں میں کیا لکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں
 رہ کر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہت ہی کم نظری اور رجعت پسندی اس ملک میں عام ہے
 اور سوز کو پار کر لینے کے بعد ایک نہایت ہی وسیع قسم کی بلند نظری انسان میں پیدا
 ہو جاتی ہے۔ دماغ کے اندر بے حد اعلیٰ خیالات آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں
 قزول باغ میں بیٹھے بیٹھے اس قدر وسیع نظر ہوں کہ چین بھین سب دیکھ سکتی ہوں
 حالانکہ سوز کو میں سفر چین میں پار کیا تھا۔ اس کے اثرات کا اندازہ اب ہو رہا ہے۔
 قابلیت کے علاوہ حجم میں ایک وصف اور بھی ہے۔ یعنی بہت کافی خوبصورت
 ہوں۔ بالکل تازہ تازہ میڈیم چین کے بیوٹی پارلر سے نکل کر آ رہی ہوں۔ بہت
 عمدہ فرم ہے۔ دیانت دار، خوش معاملہ، فیسیں بالکل واجبی اور محقول۔ ایک
 سنگ کے صرف پینتیس روپے اور بال بالکل دیو کرانے ہوں تو پچھتر روپے۔ کناٹ
 پولیس کے انفرمرکل میں ہے، فون نمبر۔۔۔

لیکن یہ رقص و سرود اور روشن آرا اور میٹیم جین کا بیڑی پارلر —
 یہ تعلیم اسلام کے منافی ہیں اور مقتضی ہیں اس امر کے کہ — بھی خوب یاد دلایا۔
 میں بہت سخت مسلمان ہوں۔ ملت بیضا پر جان بھی نثار ہو جائے تو مضائقہ
 نہیں۔ لکھنؤ میں مسلم لیگ کے سارے ایٹ ہوم ہمارے لان پر ہوتے تھے،
 چاہے جس سے پوچھ لو، اور یہاں تو فی الحال — تو دراصل بات یہ ہے کہ دہلی
 میں مکان نہیں مل رہے۔ بڑی قلت ہے مکانوں کی۔ عالم کون و مکان versus
 لامکان۔ اسے طائر لاہوتی نہ تو زمین کے لیے نہ آسمان کے لیے۔ ہوا میں معلق
 رہ۔ اسرار خودی پڑھو۔ رموز بیخودی پڑھو۔ اگر قرآن پڑھنے کی توفیق نہ
 ہو تو اقبال کا مطالعہ کرو۔ تمہاری خود آگاہی اس قدر عمدہ ہو جائے گی اور تم میں
 ایسے بال و پر نکلیں گے کہ تم انٹرویو میں آ جاؤ گے اور فوراً فلاٹ لفٹنٹ
 بن جاؤ گے۔ اقبال — ہائے اقبال — یہ ایک بہت بڑا شاعر تھا جس نے قوم کی
 بد نصیبی کی وجہ سے اس سرے فانی سے عالم جاودانی کی طرف رجعت فرمائی اور
 بد نصیب قوم نے اخباروں کے ذریعے اعلان کیا کہ وہ اس کا خرابے حد گریڈ
 بنوائے گی۔ لہذا چندہ جمع ہونا شروع ہوا اور فرزند کوہستان، شاہ افغانستان
 کی طرف سے بھی شاہی عطیے کا فرمان جاری ہوا اور اچھا اب باقی آئندہ)۔

ہاں تو مہادیو جی آپ ناچے جانیے۔ مانی پر کے سہرے مندروں کا ناچ۔
 تنخواہ کم ہے تو کیا ہرج ہے۔ رام گوپال نیچے جنوب میں ایک اور سنٹر قائم کر رہا
 ہے بھارتیہ ناتیہ اور کتنھاکلی کے لیے۔ وہاں چلے جائیے گا۔ فی الحال تو ہمیں
 جنگی ہفتے کے کنسرٹ کے لیے فوک ڈانس کی مشق کرائے جائیے۔ بڑا اسکوپ

پڑا ہے۔ ہندوستانی رقص کا فن معراج پر پہنچنے والا ہے۔ تعمیرات بعد از جنگ
میں فنون لطیفہ کا روس کی طرح خاص درجہ ہوگا۔ عوام کے تھیٹر اور کلچر کمیٹی
کھولے جائیں گے (وغیرہ)۔

دادا پونا میں ایک انگریزی رنگین فلم تیار کر رہے ہیں۔ رام گوپال کو ایک
فلم میں تین منٹ کے رقص کے لیے دس ہزار روپے ملے ہیں۔ تو مہادیو جی
یہی تو دنیا ہے، آپ کے کنول کے پھولوں اور سنہری گھنگروؤں کی جھنکار سے
علیحدہ۔ اور ہم بہت پریکٹیکل لوگ ہیں۔ چلیے رہبر سل کروائیے۔ ایک دو تین۔
چھن چھن۔ بگ گھنگرو باندھ میرا ناچی رے۔ میرا ناچی رے۔



ایں دفتر بے معنی

نہ جلنے کیسا پاگل پن تھا۔ انوکھا درد کچپ۔ پر اب تو لہکشاں کا یہ تقری
 راستہ پر یوں کی سرزمین تک پہنچنے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے۔ کیسی تھکن، کیسی
 اکتاہٹ، کیسی بے کیفی۔ آدھے جلے ہوئے سگرٹوں کا بجھا بجھا دھواں فرن کے
 خشک پتوں کے اوپر سے گزرتا ہوا اندھیرے میں پھیلتا جا رہا ہے۔ فریڈ! بالکونی
 میں کھڑی شاید چاند کا انتظار کر رہی ہے۔ فریڈہ بانو اندر آ جاؤ۔ ہوائیں خشک
 ہوتی جا رہی ہیں۔ میں بہت زیادہ عقل مند ہوں فریڈہ۔ فریڈہ پیاری تم نے
 رات کو سوائے کے ڈنر کے لیے ساری کا انتخاب کر لیا؟ میرا وہ روپہلی بروکید کا غرارہ
 نکال دینا اور اس کے ساتھ کی فرنج ہیل والی جوتی۔ شاید کوئی بزرگ داررقص کے
 لیے اصرار فرمائیں۔ اور۔ اور۔ فریڈہ تم نے اس سیاہ دوپٹے پر انٹرن
 کر لیا۔ استری کا پلگ اور تار خراب ہو گئے ہیں۔ کام نہیں دے رہی ہے آج
 کل۔ اور فریڈہ بانو — dash it all کہاں تک خود کو فریب میں مبتلا رکھنے
 کی کوشش کرتے رہیں۔ فریڈہ! ایک کشن میری طرف پھینک دو تاکہ میں اس میں
 بادام جیسی اسٹیکھیں چھپا کر خوب روؤں — کیونکہ — hang it you
 blessed goose! لیکن نہیں فریڈا ڈیر۔ ہم سب کی اسپورٹنگ اسپرٹ ہونی

چاہیے — فِش — اُو خوب زور زور سے گائیں :

It was in the isle of capri that I found her !

Beneath the shades of an old walnut tree !

اُو ف ! اتنا مت چیخو۔ کھڑکیوں کے پٹ بند کرو۔ اب تمھاری بالکونی کے نیچے کوئی سیریلیٹ کرنے کو نہیں آئے گا۔ اُو کی دم۔ ہم چلتے چلتے تھک گئے اور اب آرام چاہتے ہیں۔ سکون اور خاموشی۔

ہم کو ہمار کی جگہ گاتی چڑیوں تک پہنچ کر اٹھوانی اور قرمزی بادلوں میں دھنسا چاہتے تھے۔ بلند اور علیحدہ۔ لیکن مذاق تو دیکھو ! bang ایک سخت جھٹکے کے ساتھ سب کے سب نیچے آ رہے۔ کھردری اور بے حس زمین کی پستیوں میں۔ یہ سب ایک بہت بڑا عظیم انسان مذاق تھا، ایک بے حد خوفناک لطیفہ۔ پر ایسی کبھی تم نے یہ بھی غور کیا کہ تم ہمیشہ ایک ہی سی باتیں کرتی ہو ؟ یعنی بس، مایوسی ! بھائی یہی تو ساری ٹریجیڈی ہے، پاگل پن بڑا عجیب سا، جیسے سچ جج بڑا آرٹسٹ اور انٹلیکچوئل پن سوار ہو گیا ہو۔ سترہ اٹھارہ سال کی عمر تک پہنچ کر ہم سب بہت زیادہ قابل بن گئے تھے : ہم، رومان، خطرے، تیز سُرُخ شعلوں کی گرمی، برف کے نرم اور سفید گلے، جارے کی راتوں میں آتش دان کے قریب بیٹھ کر جانے کیسی کیسی باتیں کیا کرتے تھے ! cow boy قسم کے فلم دیکھنے کے بعد عجیب عجیب تصورات دماغ میں آیا کرتے تھے : چاندنی راتوں میں خطرناک پہاڑوں میں چھپے ہوئے خزانوں کی تلاش میں سرپٹ گھوڑا اڑاتے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ ٹائمن پاور اور رابرٹ ٹیلر جیسے خوبصورت اور بہادر ہیرو

پشاور پر چڑھتے ہوئے سُرخ رومال ہمارے ہیں۔ دور — ہسپانوی خانہ بدوشوں کے کاروانوں کی گھنٹیاں بج رہی ہیں۔ آؤ طوفانوں سے لڑیں ، شعلوں سے آنکھ چھو لی کھیلیں ، جنوب کے نیلے آسمانوں اور ستاروں کے گیت گائیں اور اسی طرح شور مچاتے ، پیچتے اور ناچتے ہوئے طوفانی لہروں کے ریلوں کے ساتھ کہیں دُور نکل جائیں — نہت دور — جانے کتنی

دور —

پھر سہارا ایک بڑا سا کڑھ تھا جس کی کھڑکیاں پہلو کے باغ میں کھلتی تھیں اور جس کے دروازوں پر بھاری بھاری گہرے سبز پردے پڑے رہتے تھے۔ اس میں ایک بڑا ٹشک بے ترتیبی سے ہمارا مصوری کا سامان ، کتابیں اور ٹوٹے ہوئے مجسمے دیوان اور قالینوں پر بکھرے رہا کرتے تھے۔ ایک کونے میں وہ پرانا پیانو رکھا تھا جو باقی اپنی شادی سے بھی پہلے قاہرہ سے ساتھ لائے تھے۔ دوسرے کونے میں ایک بڑا سا تانبے کا پردہ گھوڑا سجا ہوا تھا جس پر اپا لو بڑی شان سے چڑھا بیٹھا تھا۔ الماریوں میں رنگوں کے خالی ٹیوب اور ڈبے ، ٹوٹے پھوٹے برش ، کینوس کے ٹکڑے ، نامکمل تصویریں ، کتابیں اور جانے کیا کیا بھرا ہوا تھا۔ سبز دیواروں پر ہمارے ”شاہکار“ اور دوسری تصویریں تھیں۔ اٹھارویں صدی کی روسی اور ہسپانوی شہزادیاں ، کنار رائیں کے جنگل ، میڈونا ، آخری ضیافت ، ازابلا اور کیتھرائٹ ، ڈکنسن اور روسٹی کے پروفائل۔

اس کمرے کو اسٹوڈیو اور لیٹن کوآرڈر کہہ کر کتنی مسرت ہوتی تھی۔ اب

خوش ہوتے تھے اور حمی پریشان - اللہ یہ لڑکیاں کس کے گھر میں بچ سکیں گی !
 اور ہمارا چھوٹا بھائی اسلم کہتا : ”میں ایسے ایسے خوفناک بم بنایا
 کروں گا کہ بھیجی تمہاری روح خوش ہو جائے گی - اے فرانسیسی صوفوں
 اور ایرانی قالینوں پر عمر بتانے والی بورڈوا گاہریہ جب عالی جناب !
 صاحب دون اسکول میں تقسیم انعامات کے لیے تشریف لائیں گے اور تم اپنے
 کانورٹ choir کے ساتھ بڑی مستعدی سے آنکھیں بند کر کے خوش آمدید کے
 نغمے الاپ رہی ہو گی اور دہلہا بھائی خوش خوش سرگرمی سے اے - ڈی - سی -
 بنے پھر رہے ہوں گے اس وقت یہ خاکسار چپکے سے ایک نہایت نفیس سا -
 ”چپ بہر بچو ! کیا پاگل پن ہے ؟“ ہم ریڈ کراس پارٹی کے ساتھ بل
 کھاتی ہوئی سڑک پر تیزی کے ساتھ چڑھتے کیمپ کی طرف جا رہے تھے زنجیوں
 اور اطالوی قیدیوں کے لیے تحفوں کی پارسلیں اور ڈوکریاں لیے - دکنٹر آہستہ
 آہستہ گنگنارہا تھا اور بڑے زور سے جھکڑ چلنا شروع ہو گیا اور پھر بادل
 پھینکنے لگے - فضاؤں پر زرد زرد پتے پھیل گئے - گونجتی ہوا میں چکر کاٹنے والے
 خشک پتے - ”دکنٹر ! دیکھو میرا اسکارف اٹا جا رہا ہے - اور تیز کر دو رفتار -
 جی چاہتا ہے سلمے اس نفرتی رہن کی طرح پھیلی ہوئی سڑک کو انجن میں سیٹے
 ہوئے سرخ افق میں جا گھسیں -“ ”فریڈا اتنا کیوں اترا رہی ہو - گویا
 طوفان کی گرج سے مارٹ فیل فرما جائیں گی - آپ - خدا غارت کرے تمہیں - سرخ
 سینگوں اور لمبی دم والے شیطان کی نواسی -“ ایک چٹان اور ٹوٹ کر کھنڈ میں جا
 گری - ”اور تیز کر دو رفتار - یہاں تک کہ - یہاں تک کہ جا کر آسمان کے کنارے

ٹکرا جائیں۔ ان سیاہ بادلوں کے پرچے اڑا ڈالیں چاہے سارا پٹرول ختم ہو جائے۔
 اور ہم کیمپ کی طرف قیامت تک یونہی بڑھتے چلے جائیں۔ یہ تیز رفتاری ہی تو زندگی
 ہے۔ وکٹر، ذرا سوچو تو، کتنا مزا ہو گا۔ اگر ہم اسی زناٹے سے چلتے رہیں۔ اور
 کار کے سارے بیڑنگ جل جائیں۔ ٹائر برسٹ ہو جائیں۔ ساری کائنات میں آگ
 لگ جائے۔ سچ حج کی آگ۔ اوفوہ۔ میں تو خوشی کے مارے مرجاؤں بالکل۔ پھر
 جب یہ نظامِ عالم جل بھٹن کر رکھ کا اونچا سا ڈھیر اور کھنڈر بن جائے تو پھر اس دھواں
 دھار اندھیرے میں ہم ایک دوسرے کو پکارتے پھر میں۔ کہاں ہو اسما اور فریڈا
 اور امبریش اور وکٹر۔ آؤ ہم سب مل کر رقص کریں۔ موت اور تباہی کا رقص۔
 کھارتِ ناتیم اشائل میں۔ امہو، واقعی دیکھو انجن میں آگ لگ گئی۔ انجن میں
 دھواں اٹھ رہا ہے۔ اچھا آپ پائپ فرما رہے ہیں۔ سلمان صاحب! دیکھیے
 آپ نے لیڈیز سے پوچھ لیا ہوتا کہ آپ کی موجودگی میں اس خاکسار کو دھواں اٹھانے
 کی اجازت ہے؟ کاش ایک ایسا سیلاب آئے کہ آپ مع اپنے پائپ کے ساری دنیا
 سمیت اس میں غرق ہو جائیں۔ ایک لالو کی دم کا پر بھی باقی نہ رہے۔ علامہ حرم
 کا شعر کچھ ایسا سا ہے :

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

اور خاکستر سے اپنی اک جہاں پیدا کرے

تو سلمان بھائی تخریب کے بعد تعمیر۔ میری ہمارا پروگرام ہے۔ ہم ادب اور
 موسیقی اور چھاپا چھڑا کے ذریعہ جنّت کی خدمت کر رہے ہیں۔ آپ نے ہمارے اوپن
 ایئر اور پیلز تھیٹر نہ نہیں دیکھے۔ ہمارے افسانے اور نظمیں ملاحظہ نہیں فرمائیں۔

آپ کیا جانیں ہم کیونٹ پارٹی کے لوگ کس قدر صاحبِ نظر — اور — بات یہ ہے بھی کہ میری اردو کافی سے زیادہ کمزور ہے۔ بچپن سے کانٹ میں پڑھا ہے اس لیے — اور اگر ایسے ہی دوچار بے تکے مضمون یا افسانے لکھ لیے تو کیا ہوا۔ بات بات میں انگریزی کی مدد یعنی پڑتی ہے۔ یعنی جملے کے جملے انگریزی کے ٹھونسے جلتے ہیں۔“

”اوہ مس حیدر! آپ تو انکسار کی حد کرتی ہیں۔ اجازت ہے کہ پاپ سگلاؤں؟“
 ”ضرور۔ آپ کیا کرتے ہیں مسلمان بھائی!“

”جی میں موجودہ حالت میں آنے سے پہلے ایم۔ اے۔ کا امتحان دیا کرتا تھا“
 ”اور آپ؟“

”اور میں ریڈ کراس میں کام کر کے چاکلیٹ کھانے کے علاوہ تصویریں بنانے اور افسانے لکھ کر ملک و قوم کی خدمت میں دن رات مصروف رہتی ہوں۔“
 ”اوہ ایسی، خدا کے لیے اتنی باقونی کیوں بن گئی ہو اور ان صاحب سے کہو کہ اتنی تیزی سے اپنی ٹانگیں نہ ہلائیں۔“

”چپو تو فریدا۔ میں ان سے نہایت اہم مسائل پر تبادلہٴ خیالات کرتی رہی ہوں۔ جی تو مسلمان صاحب وکڑے سے کہیے کہ رفتار اور تیز کرے۔ کیمپ میں ہمارا سخت انتظار کیا جا رہا ہوگا۔ ہم بچارے زخمیوں کے لیے خوبصورت تحفے لیے جا رہے ہیں۔ بھلا ہم سے زیادہ ملک و قوم کا ہمدرد کون ہوگا۔ خدا سرکار کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ رات دن برطانیہ کی فتح کی دعائیں مانگتے ہیں۔ ہمارا می ایک کوٹھی میں اطالوی قیدیوں کو جہان رکھا گیا ہے۔ ہم ہندوستانی بڑے بہمان

فوانہ ہوتے ہیں۔ اور کسی بد تمیز نے یہ خبر اڑا دی کہ خدا نہ کرے فریدا اس مانہجی بالوں والے اطالوی کو، جو لمبی کے سائے میں، سبز بید کی کرسی پر بیٹھا، گتا رجا یا کرتا ہے، چیری کے مربے اور مارملیڈ بھیجا کرتی ہے۔ جناب عالی! یہ تو ہمارا اخلاقی فرض ہے کہ ان بچاروں کی میزبانی کریں۔ فٹش۔

”لیکن فریڈا تمہیں وہ اطالوی قیدی یاد ہے جو ایک دفعہ کیا دیوں میں کام کرتے کرتے کدال پر ہاتھ ٹیک کر تم سے نفرتی اُدا نہ میں بولا تھا :

”سینوریتا! اجازت دو کہ میں یہ زرد کلیاں تمہیں پیش کر کے اپنے گھر کے تاکستانوں اور سیاہ آنکھوں والی کنواریوں کی یاد میں ایک چھوٹا سا گیت گاسکوں۔“

”خدا غارت کرے ان سب کو۔ مگر کیسے خوبصورت ہوتے ہیں یہ۔ اور پھر سوچو کہ ایسے خوبصورت، سینفورتیاؤں کو جنوبی تاکستانوں کے نغمے سننے والے، رونانہ ہزاروں لاکھوں ختم ہو رہے ہیں۔“

”وڈیشاٹ۔ ابھی کل ہی تو..... پر اڑان کرتے ہوئے پولو کے پیارے میں آگ لگ گئی اور وہ جل کر مر گیا۔ تو کسی نے کیا کر لیا۔ وہ بھی تو صرف اٹھارہ سال کا تھا۔ اور وائلن پر بلوڈ فیلوب بجایا کرتا تھا۔“

”لیکن مس جید آپ کو زندہ چاند اور نیلا سمندر اور پام کے درخت اور قہوے کی بھاپ، یہ سب چیزیں بہت دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔ رومان۔ رومان۔ کیا مصیبت ہے۔ جی ہاں قطعی۔ تو آئیے آج سے زندگی کی کھردری حقیقتوں کا مطالعہ شروع کر دیں۔ آہ وہ دیکھیے، سڑک کے کنارے پہاڑی مزدور

پتھر کوٹ رہے ہیں تاکہ سامراجی مشینیں اور موٹریں ان کو روندتی ہوئی گزریں۔
 آف وہ — لیکن — "bang! — سوائے عین آکر سڑا بجنے لگا۔ کیرے
 شروع ہونے والا تھا۔ شام کی نیلگوں خاموشی میں گوارٹر لیڈن کے ایک درتچے
 میں سے مدھم سی سبز اور نیلی روشنی اندھیرے کو کاٹتی ہوئی دُور تک جا رہی تھی۔
 بالکل اسی طرح جیسے — جیسے — افوہ! اسماء پیاری پردہ گرا دو۔ کیتھڈرل
 کے میناروں کے پیچھے سے اٹھتا ہوا چاند کا گیت جھیل کی لہروں پر بکھرتا جا رہا ہے۔
 کاش کوئی اس وقت اس درتچے کے نیچے اس کہکشاں جیسے نقرئی راستے کے
 کنارے کھڑے ہو کہ سیرینیڈ کرے۔ لیڈی آواسپین! میرا نغمہ سنو!

Lady of Spain ! I'm hearing of you

Lady of Spain ! I'm yearning for you

Lady of Spain ! I love you !

لیڈی آواسپین اپنے بالوں میں سجے ہوئے پھیری کے شکونے نیچے پھینک دو۔
 میں ڈانٹن بجا رہا ہوں۔ چاند سیاہ آنکھوں والے پری زادوں کے نغموں میں
 تیر رہا ہے۔ تمھارے درتچوں میں سبز روشنی کی موجیں خوابوں کی بستی کی طرف بہتی
 جا رہی ہیں۔ کرنوں کی میڑھیاں بنا کر پھولوں کی اس وادی میں اتر آؤ جہاں میں
 سیرینیڈ کر رہا ہوں — لیڈی آواسپین!

افوہ اسماء یہ ڈانٹن یونہی بجاتا رہے گا۔ پردے ایک طرف کو سمیٹ دو
 چاند نگار خانے میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس سے کہہ دو ابھی انتظار
 کرے۔ سنہری بانسریاں بجانے والے پری زاد شاہِ بلوط کے جنگلوں میں چھپے

بیٹھے ہیں۔ اُدھی رات کو جب کیتھڈرل کے گھنٹے کی گونج لرزتی ہوئی خاموشی میں ڈوبنے لگی اس وقت ہم مائلو فراوریا سمین کے پودوں کے پیچھے پرستان کا راستہ ڈھونڈنے اس وادی میں آئیں گے۔ روشنی بجھا دو۔ چاندنی میں شبنم برس رہی ہے۔ ہمیں سونے دو !

اس کی آنکھیں بھی کہہ رہی تھیں : ہمیں ان سبز پردوں اور چیری کے شکوفوں کا خواب دیکھتے ہوئے سو جانے دو۔ فریدا اور اسماء سنن دھارے کی جانب پڑھتے پڑھتے تھک کر پکڑنڈی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئی تھیں اور ساتھی آگے جا چکے تھے۔ وہ ان دونوں کا ساتھ دینے کے لیے قریب آ گیا : ”ماڈوزیل شاید آپ تجھے نہیں پہچانتیں لیکن میں آپ کے ہمراہ رقص کر چکا ہوں۔ میں سگریٹ پی سکتا ہوں۔“

”اوہ ، یقیناً !“

”شکریہ ! آپ ؟ نہیں ؟ غالباً آپ کو یاد ہوگا میں پرنس یو چین

تھا۔“

”اوسو۔ جی ہاں ، بالکل۔ مجھے ماسک میں سے صرف آپ کی آنکھیں نظر آتی تھیں۔ اچھا تو آپ ہی طہران سے تشریف لائے ہیں۔ آپ خاصے دل چسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔ میری چھوٹی بہن کو جب معلوم ہوا کہ آپ لیٹن کوارٹر میں اتنے دنوں رکے ہیں تو اس کا تو انتقال ہو جائے گا۔“

اور وہ دیوان کے ایک کونے پر آکر اس طرح بیٹھ گیا جیسے کسی نے اسے

نیں سے جگانے کے بعد زبردستی کرے میں دھکیل کر بیچھے سے دروازہ بند کر دیا ہو۔
 فرید اکا جی چا ا کہ چپکے سے اسی وقت اپنی اسکیج بگ پراس کا پرو فائیل کھینچ
 لے اور پھر بعد میں عمر بھر اس میں رنگ بھرتی رہے۔ پھر مسوری میں ایک
 سب سے بڑی نمائش کرے جس میں صرف اس کی تصویریں ہوں — مختلف
 انداز کی — طیارے سے اترتے ہوئے پرنس یو جین کے بھیس میں رقص کرتے
 ہوئے، جھک کر سگریٹ جلاتے ہوئے، دھوپ کا چہنٹہ لگا کر دور مپاڑوں کی
 طرف دیکھتے ہوئے — اس طرح — اس طرح — توبہ اللہ! —

اور فرید اکشن پر کہنیاں ٹیک کر بڑی معصومیت سے اس سے پوچھتی :
 ”آپ کا کام سچ جج کتنا خطرناک ہوتا ہوگا۔ اڑتے ہوئے طیاروں اور ڈوبتے
 ہوئے جہازوں پر سے وہاں کے مناظر کے فلم لینا اور رمان کی خبریں بھیجنا دبا لکل
 ٹائٹرن پاؤر کی طرح)۔ کیسی adventurous زندگی ہے آپ کی۔ اور آپ
 آکسفورڈ میں کرا کا کے ہم جماعت رہ چکے ہیں۔ اوفوہ!“

ایسا محسوس ہوا جیسے وہ نگار خانہ کے کونے میں رکھے ہوئے اپا لو کو نیچے
 گرا کر اس کے آسمانی رتھ پر چڑھ گیا اور ساری کائنات اس کے سوئیڈ کے
 بوٹوں پر جھبک کر اس کی پرستش میں مصروف ہو گئی۔

”کتنی rash ہو جاتی ہو تم لوگ۔ یعنی یہ انتہا ملاحظہ فرمائیے کہ صاحبزادی
 ایک رات سوائے کے فیفسی ڈریس بال میں ان بزرگوار سے ملیں اور اگلے ہفتے منگنی
 کی خبر سوسائٹی میں اناؤنس کر دی گئی۔ کچھ پتا نہیں لڑکا کون ہے، کہاں سے آیا
 ہے، کہاں کو جائے گا؟ لیکن یہ عجب لڑکیاں ہیں : مغرور، ضدی، خود مرء

خود پسند۔ کسی کو خاطر ہی میں نہیں لائیں۔ اپنی کوٹھی کا نام ایشیا نہ رکھ چھوڑا ہے۔ حالانکہ اسے ڈو کہنا چاہیے۔ دُنیا جہان کے خوگوش، پہاڑی طوطے، لنگور اور جانے کیا کیا بلائیں پالی ہوئی ہیں۔ بنتی اس قدر ہیں جیسے ابھی پیرس سے چلی آ رہی ہیں۔ ابھی پرسوں دوپہر، باہر بوندیں پڑ رہی تھیں۔ فریدہ بانو نے ریڈیو گرام پر کوئی چیتنے چلانے والا انگریزی ریکارڈ لگا کر مجھ سے ارشاد فرمایا: ”آئیے شوکت بھائی لیجئے واک کریں“ میں غریب کیسے پوچھتا کہ یہ کس مصیبت کا نام ہے۔ اور پھر وہ اسی نیلی آنکھوں والے لونڈے کے ساتھ جو طہران سے آیا ہوا ہے، برآمدے کے فرش پر اُچھلنے کو دے لگیں۔ لڑکیوں کو اتنی آزادی دینی بھی کیا ضروری ہے؟“

مگر اس وقت ان خود سر اور ضدی لڑکیوں کے پاس شوکت بھائی کی ان جلی بھنی باتوں پر ناک بھجوں چڑھانے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ اسماء بڑی فکر مندی کے انداز میں میز کے کونے پر بیٹھی دانتوں سے ناخن کتر رہی تھی: ”سبجیگی سے مسئلے پر غور کرو جی۔ ممی کو کیسے bluff کریں اور اگر شوکت بھائی نازل ہو گئے۔ اور ابی کو کس طرح بتائیں کہ وہاں دکر اور کمی ماؤس کے علاوہ امبر بھی ہوگا۔“ ”امبر سے ابی کو خصوصیت کے ساتھ چڑھے۔ وہ اس وسیع دنیا میں یکہ تنہا بچارہ انسان۔ امبر بتاؤ میں کیا کروں۔ ابی اجازت نہیں دیتے کہ میں تمہاری میٹنگ میں شرکت کروں۔ ممی کس وقت سونے جاتی ہیں۔“ کاش کوئی دیکھتا کہ پُرانی دنیا کے خلاف کس طرح اسکیمیں بنائی جا رہی ہیں۔ بہت معصومیت سے۔

چاؤ کی میز پر ابی نے عینک اتار کر اخبار پر دیکھ دی: ”آپ کو یہ کب سے

ہو گیا کہ آپ ممی کے بغیر وہاں تشریف لے جا سکتی ہیں۔ بہتر ہوگا کہ آج کی شام آپ
خوگوشوں اور پوٹلی کے ساتھ گزاریں۔“ اور وہ اخبار اٹھا کر اپنے دارالمطالعہ کی
طرف چلے گئے۔ — امبریش — امبریش۔

پرامبریش کم از کم تم پارٹی میں تو آجانا جو ہم فریدا کی منگنی کی خوشی میں
راجپور میں مسنر چھپ یکن کے ہوٹل میں دے رہے ہیں۔ تم نے شاید اب تک
فریدا کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی — اور نہ سمجھے۔

ان دنوں رام گوپال اپنے ٹروپ کی موٹر کیوں کے ہمراہ ہمارے یہاں ٹھہرا ہوا
ہوا تھا۔ دنیا جیسے گیتوں اور تہمتوں کے جھولے میں بھول رہی تھی۔

ہوٹل کے لان پر اسلم خوش خوش مہانوں کا ایک دوسرے سے تعارف کرانا پھر رہا
تھا۔ خالد صاحب آئے آپ کو اپنے مہانوں سے ملائیں: آپ انڈین آرمری آفیزر
ہیں۔ ابھی ایران اور اٹلی سے آ رہے ہیں — اور یہ ہیں مسٹر رام گوپال —

India's dancing son — اور آپ مس جانکی ہیں۔ بھارت ناتیم سٹائل
میں ہندوستان کی نمبر ون — پریذیڈنسی کالج مدراس میں جو نیر بی۔ ایس سی۔

میں پڑھ رہی ہیں — اور یہ سبگم شاہد اور بنیادیوی — ڈیش اٹ مسعود۔
تکلف برطرف — ہم یو۔ پی۔ والے ہیں۔ پر آپ ہنستے کھیلتے پنجاب کے بایسوں

کے ساتھ تکلف کیسا۔ کرسیاں ایک طرف کو رکھ دی گئیں اور سب گھاس پر بچھے
ہوئے قالینوں پر بیٹھ گئے۔ سرخ موٹھوں والے انگریز اور فرانسیسی ہبیاہ چشم

اطالوی یہ مشرق و مغرب کا ثقافتی اتحاد تھا۔ اسلم گرامفون پر بیٹھ کر چلا یا:
ہمٹی، India's dancing son شروع کرو اپنا رقص۔ دھیم تانا تانا تانا

دھی ری نا دھیم۔ جاٹکی بھی اٹھ کر قص میں شامل ہو گئی۔ اؤ فریدا ، آمنہ ، اسماء ، اوم مہاسے ساتھ فوک ڈانس میں شریک ہو جاؤ۔ رقص ہوتا رہا۔ لیکن نینا ایشیائی شہزادیوں کے سے وقار کے ساتھ قالین کے سرے پر بیٹھی سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بناتی رہی۔ شاید وہ غم و نکمہت کے اس طوفان سے دور اپنے مہمے شوہر کا انتظار کر رہی تھی جو دور فلپائن کے جنگلوں میں موت سے لڑ رہا تھا۔ ممتی ، خالہ ، اچی اور ابی مسز چیپ مین کے ساتھ برآمدے کی سیڑھیوں پر آکر کھڑے ہو گئے۔ ان کے سامنے لان پر ان کے بچے خوش خوش زندگی کی مسرتوں سے کھیل رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور شیریں بچے۔

پھر سب نیچے وادی میں آنکھ جھولی کھیلنے کے لیے اتر گئے۔ رام ادھر سے کود جاؤ۔ فریدا تم چٹان پر سے فوراً گر جاؤ گی۔ امبولینس منگوا کر ہسپتال پہنچا دیا جائے گا ، اطمینان سے۔ نینا ڈارلنگ سگریٹ کا ڈبہ پھینک دینا ادھر۔

وادی میں اندھیرا چھپاتا جا رہا تھا۔ مسز چیپ مین نے آخری بار کھڑکی میں سے جھانک کر نیچے دیکھا اور پھر دروازے بند کر کے کونے میں اپنے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ وادی میں سے ان شیریں بچوں کے قہقہوں کی اور سیٹیوں کی مدھم آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔ انہوں نے آتش دان کے اوپر لگی ہوئی ٹی وی کی تصویر کی طرف بھیگی ہوئی بوڑھی آنکھیں اٹھائیں اور آہستہ سے کہا : "God bless them." مسوری کی اونچی چوٹیوں پر سے سرو اور چیرٹھ کے درختوں کی خوشبو میں بھیکا ہوا ہوا اکامیک جھونکا مسز چیپ مین کے چاندی کے تار جیسے بالوں کی لٹوں کو ہلاتا ہوا دوسرے درتچے سے باہر وادی میں نکل گیا جہاں آمنہ ، اسماء اور اوم

کے گیتوں کی صدائے بازگشت اب تک گونج رہی تھی۔

Under the greenwood tree

Who loves to lie with me

Come hither, come hither, come hither,

There is no enemy

But winter and rough weather.

امبر تم کہاں کھو گئے اور خالداور فریدہ — رام، نینا اور جانکی اسٹیشن
ویگن پر سوار ہو کر روز مارونٹ واپس جا چکے تھے کیونکہ ایسی رات کو انھیں
Forces کو entertain کرنے کے لیے رقص کی تیاری کرنی تھی۔

امبر تم ہمیشہ کو پیک کرنے میں میری مدد کرو۔ پارٹی کے بعد کی تھکن،
بھاری بھاری آنکھیں، تھکے تھکے قدم۔ امبر شیش کیا واقعی تمہیں رنج ہے۔
لوان پیالیوں کو اس ٹوکری میں ٹھونس دو۔ فریدا — ہاں وہ وہیں ہے۔
آبشار کے کنارے اب تک؟ اندھیرا ہو گیا ہے اور وہ بہت خطرناک جگہ
ہے۔ — نہیں اس کا منگیتر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ اس کا
منگیتر — وہ یہ چچے گنتے جاؤ۔ زندگی کا راستہ بہت پتھر پللا اور کٹھن ہے۔
اسماء رانی — افو حماقت کی انتہا۔

حماقت کی انتہا — تعجب کی بات ہے ناکہ میں تمہارا پورا نام نہیں جانتی
— میرا خیال ہے کہ میں خاصا matter of fact قسم کا انسان ہوں۔ شاید
تمہیں اس بات سے تکلیف ہو۔ — ادہ گوش! تم نے غالباً اب تک یہ نہیں
سوچا کہ سہاری عمروں میں کتنا فرق ہے۔ میں تمہارے سب سے بڑے بھائی

سے بھی چار سال بڑا ہوں۔ میری بیوی اور بچے ایران میں موجود ہیں۔ لیکن تم تو انھیں طلاق دے چکے ہو۔ اور ہو تمھاری بہن اور وہ کمیونسٹ دوست مسز جیپ مین کے دناں سے تمھیں آوازیں دے رہے ہیں۔ وہ فریدا کا بازو تھام کر ہٹس کی پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ اور فریدا کو ایسا لگا جیسے وہ آبشار کی گہرائیوں میں گری جا رہی ہے۔

رات کافی آگئی تھی۔ نینانے ڈریسنگ روم کی کھڑکی کھولی۔ ہو فریدا! ماں ماں آ جاؤ۔ فریدا اندر آ کر سنگھار میز کے کونے پر بیٹھ گئی۔ نینانے بھویں پلک کرنے کی چپٹی آہستہ سے میز پر رکھ دی اور سگریٹ جلا لیا۔ ”رام کب جا رہا ہے؟“ فریدانے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“

”صبح تو وہ فونی پر تاملنک والوں سے امریکہ کے passage کے متعلق طے

کر رہا تھا۔“

”ماں لیکن میرا خیال ہے کہ میں جلدی بنگلور واپس چلی جاؤں گی۔“ اس نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ دی اور بھویں اٹھا کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ ”آج شام میں خاصی فکر مند سی ہو رہی ہوں۔ میرے شوہر کا خطائے مدتیں گزر گئیں۔ وہ فریدا تم نہیں جانتیں یہ لوگ کیا ہیں۔ سب ایک سے۔ بہت پرانی شکایت ہے مگر بالکل صحیح۔“ اس نے جھک کر فریدا کا گلابی آنکھوں والا سر گوش اٹھا لیا۔

”اچھا شب بخیر دنیا۔ اب تم آرام کرو۔ آج تم بہت کافی تھک گئی ہو گی۔“

میں دیکھ آؤں میری بہن جانکی پر اپنی مصوری اور افسانہ نگاری کی قابلیت کا رعب

”جھاڑ کر اس کا دماغ چاٹ رہی ہے یا نہیں۔“

لیکن فریدا جانکی کے کمرے میں جانے کے بجائے ایک مہم سرخ لائٹیں لے کر بیچیدوں کا باغ پار کر کے جانوروں کے شید کی طرف چلی گئی اور وہاں ایک اسٹول پر اس وقت تک بیٹھی رہی جب تک کہ شید کی سرخ ٹین کی چھت پر ٹپکنے والی بارش کی بوندوں اور کیتھڈرل نے اسے یہ یاد نہ دلایا کہ مہازوں کے ناشتے کی تیاری کے انتظام میں جمی کی مدد کے لیے صبح سویرے جاگنا ہے۔

سید سائٹی کی دلچسپ ترین gossip - حتیٰ خفا، اپنی ناخوش، اسلم پریشان اور شوکت بھائی پر تو بالکل panic سوار ہو گیا۔ جولائی کا مہینہ بھی گزر گیا۔ فریدا رام کی تصویر میں بے دلی سے رنگ بھرتی رہی۔ اسماء نے جھنجھاکر سارے برش زمین پر پرنچ دیے اور دریچے میں جا کھڑی ہوئی۔

“Farida darling, I must do some thing drastic to take the gossip off you.”

ہش، کیا کرو گی تم کمزور گلہری!

ہرش کی بھبکی بھبکی بھاری بھاری سیاہ آنکھیں میز کی لمبوریں سطح پر لوزن لگیں۔ زندگی کا راستہ مہبت پتھر لایا اور کٹھن ہے اسماء رانی! فریدانے نامکمل تصویر میز کے نچلے خانے میں ڈال دی اور اسماء کے پاس آگئی۔ آشیانے کی طرف بادل اور طوفان بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ دور گولیاں چلنے کی آوازیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے نا۔ ایک دم انہیں کچھ یاد سا آ گیا۔ فریدا کمرے

میں ٹہلنے لگی۔ اور پھر ایسا ٹریسا کی تصویر کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ گویوں کی گرج میں سے امبر کی آواز کہتی ہوئی معلوم ہوا وہی تھی : میں تمہاری کہکشاں کی پگڈنڈی سے علیحدہ ہو گیا ہوں۔ اسماء رانی کتنی اچھی ہے کہ میرے ساتھ سفر کرنے کو تیار ہے اس راستے پر، جہاں گولیاں برستی ہیں، اس دنیا میں جہاں پولیس ہماری الماریوں کی تلاشی لیتی ہے، جہاں ہماری شوق اور محنت سے لکھی ہوئی کتا بنی ضبط کر لی جاتی ہیں اور جہاں آخر میں ہمیں تاریک کمروں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ تم نیلوفر کے شکونے کی طرح نازک اور کمزور ہو۔ تمہیں حفاظت کی ضرورت ہے۔ تم پر شور طوفانی ندیوں اور اونچے پہاڑوں اور ریت کے میدانوں کو طے نہیں کر سکتیں۔ اسماء شاید اس سفر میں کامیاب ہو سکے۔

اگست کی بارشیں اور تیزی سے برسنے لگیں۔ کار نے دھواں چھوڑا اور ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ”خدا حافظ فریدہ، تم خوش گھر واپس آ جاؤ۔ ایشیائے بکلیوں کی زد سے اچھی طرح محفوظ ہے۔ شوکت بھائی سے شادی کر لو اور پھر اپنے سات آٹھ بچوں کے لیے عمر بھر موزے بنتی رہو۔ اور فریدہ پیاری مئی اور ابی کو میرا دوسرا دینا اور ان سے کہنا کہ سمجھنے کی کوشش کریں۔“

۹۔ اگست کے فوراً بعد امبر کی گرفتاری کا پروانہ اچکا تھا۔ کارزنٹاٹے سے ترائی کے میدانوں میں اترنے لگی اور موہن پاس کے موڑ کے نزدیک ایک مہبت مہاری ملٹری پولیس کی مسلح کار سے اس کی ٹکڑ ہو گئی جو مخالف سمت سے اسی تیزی کے ساتھ آ رہی تھی۔ اور امبر کی سیاہ آنکھیں زخموں کے بوجھ سے آہستہ آہستہ بند ہونے لگیں اور وہ خاموشی سے سیٹ پر گر گیا۔

اور یہ پُرانی دنیا اسی طرح قائم ہے۔ ابی شاہ بلوط کی بھاری میز پر کافذات پر
 جھکے اسٹاک ایکسیجنگ کے کاروبار میں حد سے زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ نگار خانے
 میں آتشزدان کے اوپر کے شیشوں کے پیچھے سے بلو بوائے اور لیڈی جین گرے
 ہمیشہ کی طرح جھانک کر مسکرا رہے ہیں۔ رام گوپال کی تصویر میز کے پچھلے خلعے میں ادھر کی
 پڑی ہے۔ تلنبے کا ایک گھوڑا، جس پر یونانی دیوتا مسوار تھا، گرد میں اٹا ہوا بڑے
 سکون کے ساتھ اسی کونے میں رکھا ہوا ہے۔ گھوڑے کا ایک کان اور پالو کے تیر کی
 کمان ڈوٹ چکی ہے۔ شمران کے پہاڑیوں کے مناظر کی جو تصویریں فریدانے بنائی
 تھیں وہ سب کی سب بہت احتیاط سے کینوس میں لپٹی ہوئی الماری کے اوپر رکھی
 ہوئی ہیں۔ شمران، جہاں وہ اپنی فرانسیسی بیوی اور چار سالہ بچی کے ساتھ اطمینان
 سے رہتا ہے۔

یہ فرن کے خشک پتے اور پنیری کی زرد اور اودی پنکھڑیاں اپریل کی ہواؤں
 میں اڑی جا رہی ہیں۔ دروازہ بند کر کے آؤ اب نیچے چلیں جہاں لیچی کے سائے میں
 شام کی چادر پر سہارا انتظار ہو رہا ہوگا۔ اس بوڑھی دنیا میں serenading اور
 امبرش کے لیے قطعی کوئی جگہ نہیں۔ فریدہ بانواندرا جاؤ۔ اب تمہاری بالکونی کے
 نیچے دائیں بجانے کوئی نہیں آئے گا — کوئی بھی نہیں۔

ہم لوگ

ہاؤ — ہووہ — ہولیوٹینٹ — اہم — ٹٹ ٹٹ — فلکس
 — پ — مے فیئر — یاہ — اوکے — ٹیڈل اووسویٹی پائی —
 چیریوسیم — اور دوسرے لمحے ریٹا میری بہن نظروں سے اوجھل ہو جاتی
 ہے۔ جیسے آپ ایک بار پلک جھپک کر کہیں ”جیک روٹسن“ یا ”ڈیکرڈ“
 میری آٹھ سلنڈرز والی موٹر پانی کے تیز چھنیٹے اڑاتی زناٹے کے ساتھ موٹر پر سے گزر
 کر جنوبی مال کی طویل اند اندھیری خاموشی میں کھو جائے اور پچھلے رات کے سہاری
 کہے میں ڈوبی ہوئی سڑک کی اونچی اور زرد اور دھندلی روشنیوں کی قطاریں بے بسی
 سے جھلملاتی رہیں۔ ریٹا اور پیکرڈ اور تم رائے انڈین نیوی کے گلفام ”سب
 لیوٹ“ اور تھکی ہوئی سکون اور آرام کی خواہاں یہ خوابیدہ جنوبی مال جو ہم کو
 فیئرے جا رہی ہے۔ آج رات تمام سڑکیں مے فیئر کو جا رہی ہیں کیونکہ وہاں گاٹا
 ناسٹ ہے ایک روسی اور پیرا کی نقل — سمجھے؟ کم وں، کم آل۔ ہم نے
 ایٹج اور بار اور گیلیاں اور گرین روم سب کے سب ہتھوڑے اور دانٹوں والے
 سرخ کاغذی پتوں سے سجائے ہیں۔ کچھل مرتبہ جب ہم نے مے فیئر کی ایٹج پر ہندوستانی
 رقص پیش کیے تھے تو نیلی اور سرخ دھاریوں اور ستاروں اور کیکروں والے جھنڈے

سارے میں راستہ کیے تھے ، سمجھ کا مرید ۔ اور ہو معاف کرنا تم تو کامرید نہیں ہو بلکہ
 آر۔ آئی۔ این ۔ کے ایک بے حد گلفام سے سب لفٹنٹ ہو ۔ جزل اسٹیل ول
 کا جام صحت تجویز کرنے کے بعد ” فارسی اندازے جو لی گڈ فیلو “ خوب ذور زور سے
 اس لیے گاتے ہو کیونکہ ہم ہندوستانیوں کا امریکہ اور امریکنوں سے بہت ہی گہرا قلبی
 تعلق ہے ۔

لیکن کیسی فضول سی اور کتا دینے والی باتیں ہیں یہ ۔ میں بہت تھک گئی
 ہوں اور میری مہین ریشا بھی مگر میری آٹھ سلنڈر والی کار کبھی نہیں تھکتی ۔ اس کے
 ٹائروں کے نیچے گہرا آلود لیمپوں کی مدھم روشنی میں مال تیزی سے بہہ رہی ہے ۔ س
 فیٹر ابھی بہت دور ہے ۔ میرا چھوٹا اور خوبصورت سائینڈ سے بوجھل سر اپنے شاؤں
 پر کھلو ۔ جنوبی مال تک ، صرف شمالی مال سے لے کر جنوبی مال تک ۔ یعنی کس
 قدر مختصر یہ شرح زندگی ہے ، سوچو تو !

اور ہماری دنیا ذرا اعلیٰ پیمانے پر کتنا کارآمد پٹ مینز شارٹ ہینڈ
 انسٹی ٹیوٹ ۔ ریشا خاموش ہے ۔ ریشا بہت سے اہم مرحلے اسی شارٹ ہینڈ
 میں طے کر لیتی ہے اور پھر اطمینان سے چوٹنگ کم کھاتی رہتی ہے اور اپنی بڑی
 بڑی سبز آنکھیں اس طرح جھپکتی ہے جیسے پوچھ رہی ہو ، معاف کیجیے گا ، لیکن
 کیا آپ کو زندگی بسر کرنے کا فن آتا ہے ؟ اگر نہیں تو پھر سے جا کر کنڈرگارٹن
 میں داخل ہو جائیے ورنہ میرے ساتھ آکرنا چاہیے ۔

ارے آپ کو ناچنا بھی نہیں آتا ؟ اور سو سائٹی میں یوہنی داخل ہو گئے
 آپ ؟ جیجی رچ ۔ اچھا آپ مادام والگا کے اسکول میں داخل ہو جائیے جو نیو

انڈیا کافی ہاؤس کے اوپر ہے۔ اور آپ نے اس نکتے پر بھی غور نہیں فرمایا جسے امریکن بہت اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ (فش! امریکن تمہارے اعصاب پر کب سے سوار ہو گئے ہیں بھی؟!) یعنی زندگی تجارت ہے، تجارت اشتہار بازی ہے، اور اشتہار بازی زندگی۔ یہ سب اچھی طرح کس کیے ہوئے کاک ٹیل کی طرح ایک دوسرے سے لازم و ملزوم ہیں۔ دیکھیے مادام وانگا کے رقص کے اسکول کا اشتہار کس خوبصورتی سے صرف ایک سطر میں میں نے آپ تک پہنچا دیا ہے۔ یہ فن میں نے یونیورسٹی کی تعلیم ختم کرنے کے بعد کمرشل کالج کی شام کی کلاسوں میں سخیل سیکاری کے طور پر سیکھا ہے۔ آپ حضرات بھی اس طرف توجہ فرمائیے اور گھر بیٹھے ہزاروں روپیہ کمائیے۔ اس کے علاوہ ہماری فرم سے آپ امریکن یونیورسٹی کی اعلیٰ ڈگریاں بذریعہ خط و کتابت حاصل کر سکتے ہیں۔ فیس بالکل واجبی۔ پھر آپ دیکھیے ڈبلیو۔ اے۔ سی (آئی)۔ کی زندگی کس قدر دلچسپ ہے، اور ہندوستانی شاہی بحری بیڑے کو اس وقت آپ جیسی لڑکیوں کی کتنی ضرورت ہے۔ یہ مس معینہ امام ہیں اور یہ سینٹرل مائنڈ رلیکٹا بزرگی۔

چنانچہ ہمدی پیکارڈ اسی طرح تیز رفتاری سے فیئر کی طرف بڑھتی جا رہی ہے اور ہم بہت مطمئن ہیں۔ ہمیں تھکن محسوس نہ کرنی چاہیے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ منزل، مے فیئر کی ان نیلگوں روشنیوں سے بہت دور کہیں دھندلوں کے پرے چھپی ہوئی ہے۔ منزل — فش بہت ہی لغو اور بے معنی لفظ ہے یہ۔ زندگی ذوق سفر کے سوا کچھ بھی نہیں، خصوصاً جب یہ سفر ایک پیکارڈ میں کیا جا رہا ہو۔

لیکن ریٹا اسلام احمد تم جو زندگی کی شارٹ ہینڈ میں ماہر ہو اور اپنی انسیٹیوٹی کا بہترین اشتہار، آہستہ آہستہ ناچو، کیونکہ برسات کی یہ کالی راتیں بہت جلد گزرتی جا رہی ہیں اور بادلوں کے اوپر تاریک آسمانوں میں فرتی ستارے تیزی سے گھوم رہے ہیں۔

اور صبح صبح جب کھڑکی کے نیچے پھیلی ہوئی کچی رس بھری کی مدھم خوشبو ناک میں گھستی ہے تو سبزے کے پرے رہنے والے کیپٹن عثمان اپنے درپچے میں کھڑے ہو کر یونہی بے فکری اور بے نیازی سے سیٹی بجانے لگتے ہیں۔ (یہ ایک اہم سائیکولوجیکل نکتہ ہے کہ انسان کھڑکی میں کھڑے ہو کر سیٹی کیوں بجاتا ہے۔) اس وقت ریٹا میری بہن کی آنکھ کھل جاتی ہے اور چند لمحوں تک اپنی بڑی بڑی سبز آنکھیں کاہلی سے جھپکنے کے بعد وہ دوسری کروٹ لے کر خوابوں کے فرتی ستارے کو دہلیس سے ملا دیتی ہے جہاں سے کیپٹن صاحب کی سیٹی نے اسے توڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ بجھتے ستاروں کی چھاؤں میں جنم لینے والے اپنے ہمیشہ خوش گوار اور پکے ثابت ہوتے ہیں، رس بھری کی سوئی ہوئی خوشبو کی لپٹوں جیسے۔ ان دھندلے سنہری پانیوں میں اپنی خوابوں کی کشتی کھیتی رہو، ریٹا رانی — انجانی چٹانوں اور اجنبی ساحلوں سے بچا کے۔

دیکھتے ہو کامریڈ — اس بورڈ والٹکی، اس جاگیر دارانہ نظام اور ذہنیت کی فروزاں قندیل کا وجود کتنا فضول اور بے مصرف ہے۔ اٹھ اور خوبصورت کاہل عورت، تجھے اسکیٹنگ ہاکی ٹورنامنٹ کی شیلڈ حاصل کرنے کے حد سے زیادہ بخوار غلیظ خواب دیکھنے کا کیا حق ہے جب کہ — جب کہ — جاگ کہ سُرخ سویرا آتا ہے۔ ”سُرخ سویرا“ اور تمام کیونسٹ لٹریچر آپ کو قومی کتب گھر مقابل پلازا

منیما مل سکتا ہے۔) گو مٹی کے پانہ مار بنی افق پر صبح کی پہلی کرنیں بکھرنے لگی ہیں اور
 ریشا، میری مہین، ہلکی ہلکی سیٹیوں کی آوازوں کے سپہارے خواب میں مسوری کی
 رنگ کی سطح پر شیلڈ کی جانب بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے نئے اوپر اس کے
 اسکیٹس ہر سال اسی طرح اسے جیتنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمیشہ اوپر اس کے
 اسکیٹس اور ماکیاں استعمال کیجیے۔ اور مسوری کا چیمپین این۔ کے۔ خواجہ،
 جبے ریٹلے پچھلے سیزن میں ہرایا تھا، کہتا ہے کہ ایک سخت میچ کے بعد روزیہ
 اسکولش کا ایک گلاس مجھے ہمیشہ بے حد ریفریشنگ ثابت ہوا ہے۔ روزیہ اسکولش
 کے علاوہ اگر آپ ہوس برنگلٹن کے نیلگوں کیفے میں تشریف لائیے تو ہم آپ کو رس
 بھری کی میٹرین خوشبو سونگھوائیں گے۔

اس لیے بھائی ریشا اب جاگ اٹھو۔ اتنی آہستگی سے رقص نہ کرو، سمجھیں،
 کیونکہ زندگی بہت مختصر ہے اور ہم بہت مصروف۔ اور ابھی ہم کو کتنے بے حد ضروری
 کام کرنے باقی ہیں۔ تمہیں این۔ کے۔ خواجہ کو ہرانا ہے۔ میں ہندوستانی کلچر سوسائٹی
 کے ایٹ ہوم میں مانی پور رقص پر انگریزی میں جو تقریر کرنے والی ہوں اس کے لیے
 کتابوں میں سے خوبصورت جملے چرانے میں مشغول ہوں (کیونکہ ابھی ہندوستان میں
 فن تقریر سکھانے کے کالج قائم نہیں ہوئے) اور کیپٹن عثمان کے سیرینیڈ بیکار جا
 رہے ہیں۔ اب جاگو اور ادھار دانی!

کیونکہ صبح ہو گئی ہے اور سنہری مشغلوں کے راستے تمہارے منتظر ہیں۔

صبح نو۔ افوہ۔ صبح نو!

پھر ایک اور صبح اور ایک شام — یہ دن اور راتیں — حماقت کے افسانوں

کے کارواں — بے بس و بے معنی ! آئیے کامریڈ میں آپ کو ایک نئی داستان سناؤں۔
 امید ہے آپ کو معلوم ہوگا کہ میں ایک بڑی سحر طراز افسانہ نگاہوں —
 جی ہاں۔ جی ہاں — خوب ! مس حیدر آپ کی ترنن میں نظم کی سی حلاوت،
 روانی اور لچک ہے۔ تجھے اجازت دیکھیے کہ میں اپنے تازہ ترین قطعات آپ کے
 گوش گزار کروں جو میرے نئے مجموعے ”چھپر“ میں بھی شامل ہیں۔
 عرض کرتا ہوں کہ — مجھ کو منظور نہیں چاند ستاروں کا سفر!
 میرے کھوئے ہوئے —

افوہ — بہت بہت شکریہ — واقعی کس قدر خوبصورت نظم ہے آپ
 کی۔ لیکن اب تجھے باہر جانا ہے۔ اگر آپ کسی اور دن تشریف لائیں تو کیسا رہے۔
 خدا حافظ ! کامریڈز — کھم الانگ کیپٹن !

اُف یہ سرمایہ دار !

اُف یہ لڑکیاں !!

اُف یہ لوگ !!!

عثمان، عثمان، سچ مچ میں بہت تھک گئی ہوں۔ سچ تجھے منظور نہیں
 چاند ستاروں کے سفر، بالکل سچ۔ تجھے منظور نہیں — میں نے صاف جھوٹ
 بولا تھا کہ تجھے ان سایہ دار، خاموش، سکون بخش راستوں، اس سوتی ہوئی
 موسیقی، اس تیسرے درجے کی پٹی ہوئی رومان پرستی سے شدید نفرت ہے۔
 نہ جانے کیا کیا کہتی رہتی ہو۔ بھیجئے مجھ سے افسانوں والی کے علاوہ جو دوسری
 اردو ہوتی ہے اس میں بولا کرو۔ سمجھیں؟ لیکن وہ جانتا ہے کہ میں نہیں

سمجھ سکتی — نہیں سمجھنا چاہتی -

پھر گومتی کے کنارے آموں کے سائے میں روکی ہوئی پیکارڈ کے فٹ بورڈ پر بیٹھے بیٹھے کیپٹن عثمان دنیا جہان کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ شبنمی خوابوں کی باتیں، قطعی غیر ضروری اور بالکل بے معنی جن کی کوئی اہمیت نہیں، جنہیں سنجیدگی سے لینے کا ذرا احساس نہیں ہوتا لیکن پھر بھی آموں کے سائے بڑھتے جلتے ہیں، گومتی بہتی رہتی ہے اور یہ باتیں ختم ہونے میں نہیں آتیں۔

زندگی کے سوال کو اب تک ہم حل نہیں کر سکے ہیں۔

لیکن وہ متجسس اور متلاشی اور حساس آنکھوں اور بوجھل پلکوں والی زرد و عیسائی لڑکی، جو بھائی میاں کے پاس ریڈیو کی ملازمت کی درخواست لے کر آئی تھی، بہت آسانی اور صفائی سے سوال کو حل کر چکی ہے۔

وہ سوتی ہوئی سی لڑکی، جو اس روز بڑا مدے میں پہنچ کر بھائی میاں کے سامنے جلنے سے قبل ہیٹ ریک کے آئیے میں اپنے آپ کو دیکھنے کے لیے ایک لمحے کو ٹھٹھک گئی تھی، مجھے اندر آرام کر سی پر ”لائف“ کے صفحوں میں ڈوبا دیکھ کر جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں: تم رولنگ چیئر پر جھولتی رہو مگر یقین کرو کہ میں تم سے زیادہ عقل رکھتی ہوں۔ حالانکہ میرے پاس یہی ایک بہترین ساری ہے جسے میں نے انٹرویو کے لیے اتنے دنوں سے سنبھال رکھا ہے۔ اس سے بھائی میاں نے پوچھا تھا آپ کو پہلے بھی کوئی کام کرنے کا تجربہ رہ چکا ہے؟ اور اس کی سایہ دار پلکیں لہڑا اٹھیں۔ کیسا بھونڈا اور غیر ضروری سوال ہے۔ وہ ہمیشہ سے کچھ نہ کچھ کرتی آئی ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتی رہے گی کیونکہ اسے زندہ رہ کر زندگی

کے سوال کا حل تلاش کرنا ہے۔ اور زندہ رہنا رولنگ چیرٹر پر چھولنے والوں کے علاوہ دوسروں کے لیے خاصا مصیبت کا کام ہے۔

پھر بھائی میاں نے اس سے پوچھا تھا: آپ کس قسم کی ملازمت زیادہ آسانی اور دل چسپی سے کر سکیں گی۔

ٹیلی فون آپریٹر۔ ڈرامہ آرٹسٹ۔ ری سپرشن اسٹ۔ anything,

anything - بھائی میاں نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے اس کا نام کاغذ پر بے فکری سے گرا دیا اور چلتے وقت اس نے بھائی میاں پر شکریہ کا ایک تبسم بھینکا جو کہ رہا تھا کہ تم نہیں جانتے زندگی کے پٹ مینز شارٹ ہینڈ انسٹی ٹیوٹ کا ایک اشتہار میں بھی ہوں جو گھر بیٹھے ایک ہزار ماہوار کمائے کی دعوت دیتا ہے لیکن یہ اشتہار میکارڈ کے کشنوں اور اسکیٹنگ رنگ پر پھسلنے والی نفارست کا حامل نہیں بلکہ خدا کو حاضر و ناظر جان کر شائقین کو مخاطب کرتے ہوئے ”چترا“ اور ”بیسویں صدی“ میں شایع ہونے والے اعلانوں کی قسم میں سے ہے جس کو نہایت آسانی اور بے تکلفی سے پڑھ سکتے ہیں اور جو زندگی سے زیادہ قریب اور زیادہ صحیح ہے۔

لیکن ہم اس عیسائی اور سوتی ہوئی سی لڑکی سے شکست ماننے کو تیار نہیں ہو

سکتے۔ ہم جو چاہیں۔ اور اس سے بہت بلند اور اعلیٰ وارفع ہیں۔

ہم لوگ جو ستاروں سے پرے رہتے ہیں۔ شیشے کے رنگ محلوں میں۔

اور شیشے کا رنگ حمل بہت جلد ٹوٹ سکتا ہے۔

مگر ہم چاروں نیچے زمین کی لپٹیوں میں بسنے والوں پر پتھر پھینکتے رہتے ہیں

اور چوڑنگ گم کھاتے رہتے ہیں۔

شکنتلا دارشنے، جو ہیڈ می بیمار کی طرح آنکھیں نیم وا کر کے فرہشت کے
لمحوں میں سوچا کرتی ہے کہ جب وہ فلاسٹ لیوٹیننٹ روبرٹ کے ساتھ شادی
کر کے زمانہ بعد از جنگ کے بین الاقوامی تعلقات استوار کرتی ہوئی فلاڈیلفیا
یا میامی جلمے کی توکس قسم کا بالوں کا اسٹائل بنایا کرے گی۔

اور طلعت، جو کمیونسٹ ہے اور ہندوستان کی قومی مشترکہ زبان کے لیے
صبح سے شام تک نگو مند رہتی ہے اور جب سے ہمارے صوبے میں "قومی جنگ"
پر پابندی عائد کی گئی ہے اس کا وزن پورا آدھ پونڈ کم ہو گیا ہے۔ پارٹی کے
حکم کے مطابق مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد سے اس نے حدِ مستعدی
سے پاکستان کی اقتصادیات اور حکومتِ الہیہ پر کتا میں پڑھنی شروع کر دیں۔
روزانہ ہمیں فرسکو اور شملہ کا نفرنس کے متعلق ضروری باتوں سے واقف کراتی
ہے۔ اس قدر مخلص اور سویت، سچی ہے۔ خدا را آپ ہی اس سے شادی
کر لیجیے۔

اور ریٹا، جو میری ماموں زاد بہن ہے، جس کی آنکھیں شاہِ بلوط
کے جنگلوں کے کنارے کسی بھیل کے پانی کی طرح گہری سبز ہیں اور جب سادہ سیٹ
بجاتی ہے تو کائناتِ نیردنہ بر اور فضا میں تہ دبلا ہو جاتی ہیں اور بربطِ دل
کے تار لڑنا اٹھتے ہیں اور نیلی آنکھوں والے امریکن اپنی چمکیلی ڈانچ یا نیش کے
بریک دبا کر اسے لفٹ دینے کو رگ جاتے ہیں، اسی طرح جیسے اس کی بلونڈ ماں
میری آنٹ ربیکا کے گرم مہو دی خون کشش سے حجبور ہو کر میرے ماموں میاں نے
استفسار نہ سیٹی بجا کے بین الاقوامی نسلی مسائل کی گتھی میں ایک اور چھوٹی سی

کبھی نہ کھل سکنے والی گرہ کا اضافہ کر دیا تھا۔ آئنٹربیکا، جو برلن کے ایک دیکھتے
 چمکتے ہوئے قہوہ خانہ کی ویٹرس تھیں اور میرے ماموں میاں جھنوں نے اعلیٰ طبیبی تعلیم
 حاصل کرنے کے لیے جرمنی مراجعت فرمائی تھی اور وہاں سے واپس آکر سندھوستان میں
 آذتابی اور منقشی شعاعیں پھیلانے کے بجائے ایک میڈیکل کالج میں محض فکڑ گریڈ
 لیکچرر ہو گئے تھے اور جو پروجرمن خیالات رکھنے کے جرم میں اب تک عینی تال میں
 نظر بند ہیں۔ آئنٹربیکا عرصہ گزرا اسی میڈیکل کالج کے ایک انگریز پرنسپل کے
 ساتھ بھاگ چکی ہیں اور ان کی سبز آنکھوں والی بیٹی ریٹاسیٹیاں بجاتی ہے اور
 تاروں کی چھاؤں میں رس بھری کی ٹھنڈی کونسلوں کے خواب دیکھتی ہے، اپنی
 ماں جیسے۔ اور اس کی ماں نے بھی یوں ہی ہلکی ہلکی سیٹیاں بجاتی ہوں گی۔ میرا مطلب
 ہے کہ یہ نہیں ہوتا آیا ہے۔ نظارم عالم کی تشکیل و تنظیم اسی طرح ہوتی ہے جیسی !
 لیکن حماقت دیکھیے کہ فرسکو کا نفر نیس منعقد ہوتی ہیں۔ نسلوں کے اختلاف
 سے منہج مسائل کے حل کے لیے انٹرنیشنل ہیلتھ بیورو اور لیگ آف نیشنز قائم کی جاتی
 ہے، لڑائیاں لڑی جاتی ہیں، حالانکہ اس ساری دروسری کے باوجود ان پروبلمز کو
 منہایت آسانی سے اور اطمینان کے ساتھ منہایت نفاست سے انڈیا گیٹ کے آس پاس
 تاج کے سوٹوں اور دوسوا کی کاجو میں حل کر دیا جاتا ہے۔ غور فرمائیے کہ انہی سیٹیوں اور
 جوابی مسکراہٹوں کے نفرتی اور غیر مٹی تار کے سہارے یہ دنیا رقصاں ہے ورنہ ہم سب
 کب کے ختم ہو چکے ہوتے۔ کوسے میں حرارت کی مار مل ڈگری برقرار رکھنے کے لیے یہ ساری
 باتیں بے حضوری ہیں۔ اور اس نکتے کو وہ فرد و عیسا ئی لڑکی اور میری مہن ریٹا اور
 شاہد اکرام، جو چند ماہ میں جو نیر انیسر سے ایک دم سینٹر کمانڈر ہو گئی، اور میری آئنٹ

ربیاسب اچھی طرح سمجھ چکی ہیں۔

چنانچہ یہ ہم لوگ ہیں۔ غور فرمایا آپ نے؟ اگر غور نہیں فرمایا تو اور بھی اچھا کیا۔
مجھ سے ملیے۔ میں جو اپنی گونا گوں قابلیتوں پر بہت نازاں ہوں۔ بچپن میں
کونورسٹ میں تھوڑی سی فرنچ سیکھی تھی۔ اب وہ بالکل یاد نہیں رہی مگر ت
کے رو مینٹک تلفظ کے ساتھ انگریزی کے چند خاص خاص الفاظ اس طرح استعمال
کرتی ہوں جیسے تجبوراً انگریزی بولنی پڑ رہی ہے۔ بچپن میں ایک دفعہ والدین کے
ہمراہ یورپ گئی تھی شاید دو مہینے کے لیے۔ اب کسی نئے شخص سے تعارف ہوتا
ہے تو میں اسے کہتی ہوں مجھے یاد پڑتا ہے شاید میں نے continent میں
کہیں آپ کو دیکھا تھا۔ وہ بیچارہ فوراً مرعوب ہو جاتا ہے۔ دیگر اوصاف حمیدہ یہ
ہیں کہ بہترین conversationalist ہوں۔ پہلے جب ٹینس کا بے حد شوق تھا
تو آپ پر ثابت کر سکتی تھی کہ ابھی ابھی سمت مصر اکہرا کر چلی آ رہی ہوں۔ اب کچھ
عرصے سے افسانہ نگاری شروع کر دی ہے اور اپنے ہر افسانے میں پیکار ڈیا ایک
اسٹوڈی بیکر کا ذکر کر دینا ضروری خیال کرتی ہوں۔

اور ان چمکیلے دنوں اور سنہری راتوں کا کارواں اس طرح گزر رہا ہے ہم بڑھتے جاتے
ہیں اسی منزل کی جانب جو رے فیئر کی نیلی روشنیوں سے کہیں آگے چھپی ہوئی ہے۔ طلعت
کی ”قرمی جنگ“ اور دیہاتی گیتوں کے جھوٹے، شکستہ کاتان پورہ، ریٹاک اسکیتس
— میرے ٹینس ریکٹ — ہم سمجھتے ہیں جیسے ان چیزوں نے ہماری گہرائیوں کو پالیا ہے۔
یہ ہماری شخصیتوں، ہماری طبیعتوں کی نمائندگی اور رہنمائی کرتے ہیں۔ لیکن یہ غلط ہے۔
ہمیں ان چیزوں سے بھی اتنی ہی نفرت ہے جتنی دنیا کی کسی اور معمولی چیز سے ہو سکتی

ہے۔ لیکن ہم اپنی جگہ سے ہٹ کر اپنی بارمانے کا خیال بھی نہیں کرنا چاہتے۔ دنیا کتنی بے انتہا اکتا دینے والی گھسی ہوئی اور گھٹیا جگہ ہے۔

طلعت ”ذہن پرست“ ہے (اس اصطلاح سے میں ابھی چند روز ہوئے اشک کے ایک ڈراے کے ذریعے واقف ہوئی ہوں)۔ یونیورسٹی میں بھی سب سے انشلیکچوئل اور جانے کیا کیا سمجھتے ہیں لیکن اس وقت میں اس سے کیوں کہ اگر وہ مستقل اس پوز سے اکتا گئی ہو تو دوسرا دلچپ مشغہ شروع کرے تو وہ یقیناً رو پڑنے کے علاوہ اور کچھ نہ کرے گی حالانکہ وہ کہتی ہے کہ وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔

وہ ”قومی جنگ“ پر پابندی کے خلاف ایک زوردار احتجاجی مقالہ لکھنے میں محو ہے۔ شکستہ تان پورے کوئیون کرنے کی کوشش میں مشغول اور میں اس پر مہر کہ چونکہ میں موسیقی کے میرس کالج میں سکنتھ ایرنگ رہ چکی ہوں اس لیے تان پورے کے درست کرنے کا حق قانوناً مجھ تک زیادہ پہنچتا ہے۔ خصوصاً جب کہ بارش میں لالہ کے پورے نکھر رہے ہیں اور کمپٹن عثمان کی سیٹیاں برساتی ہواؤں میں تیر رہی ہیں۔ آسان پر ایک طویل وسیع اکتا ہٹ طاری ہے۔

روم جھوم بدرطبر سے۔ روم جھوم !
 شکستہ دارشنے، تان پورے سے سڑیک کو گوڑا لہار کا خیال گاتی ہے طلعت جو سامراج اور فاشیت کے خلاف قبوے کی پیالوں کے ذریعے لڑ رہی ہے۔
 اور ریٹا جس کی آنکھوں کی سبزی میں ہمیشہ سکون اور خاموشی جھلکتی ہے۔
 محمد شاہ پیاسا رینگے۔ محمد شاہ پیاسا رینگے۔ — اُن بن حیرا تر سے۔ — حیرا تر سے کا ساون کے حینے سے کیا خاص تعلق ہے ؟

ہیولاک الیسن کا مطالعہ کرو!

ادون — اے خدا — کاش وہ سارے بکھرے ہوئے نئے ایک
مہراب سے جاگ اٹھیں جو صدیوں سے تان پورے کجے تانوں میں سمٹے ہوئے
ہیں۔ وہ پرانے تار جو ہندوستان کے رنگیلے پیاؤں کے درباروں میں پھیرے
جاتے تھے۔ وہ رنگیلے پیا جہنوں نے ہندوستان کی تاریخ کو اتنا ضخیم بنا دیا کہ
مقابلے کے امتحانوں میں ان کے متعلق جواب لکھ کر پی۔ سی۔ ایس۔ بنا جاسکے۔
دیکھا آپ نے ہم چاروں کو سیاسیات میں بھی دخل ہے۔

مجھے تمہارے میر قاسم اور تمہارے سراج الدولہ اور تمہارے جانِ عالم سے
قلعی کوئی ہمد دی نہیں۔ طلعت بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا سوچتے ہوئے یک لخت
کہا اٹھتی ہے۔ وہ عوام کی کہاوتوں اور گیتوں کی ریسرچ کر رہی ہے۔

برسورام دھڑاکے سے۔ بڑھیا مرگئی فاقے سے۔

کتنا زبردست اور عظیم الشان انکشاف ہے کہ عہدِ زیریں میں، سامراج
اور قحطِ بنگال سے بھی بچے بڑھیاں فاقے سے بھی مرا کرتی تھیں۔

فرش — کپٹن عثمان —

ایک نقطہ پر ہم ہر پھر کے آتے آتے رُک جاتے ہیں۔

جہنم میں جا میں تمہارے کپٹن عثمان اور جانِ عالم پیا — سب کے سب۔

اور میری بادام جیسی آنکھوں میں پانی چھلک آتا ہے۔ مجھے اپنی بیکار تاریخ، اپنے
مردہ بادشاہوں سے عشق ہے۔ میں انھیں موردِ الزام ٹھہرتے دیکھنا برداشت
نہیں کر سکتی۔ اودھ کے وہ پُرتے بادشاہ جن کی عطا کی ہوئی جاگیروں کی آمدنی

اور معجونیں کھاتے کھاتے میرے سارے بزرگوں نے مہرہی پر انتقال کیا۔ وہ بزرگ جن کی خلعتوں والی موغنی تصویریں ڈرائنگ روم کی شان میں اضافہ کرتی ہیں اور پکار پکار کر کہتی ہیں کہ اے آنے والے تم ایک تعلقہ دار کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہے ہو جس کے پردادا کے پاس پینتالیس گاؤں تھے اور جس کے پرپوتے نے فروخت اور ضبطی کے سلسلے کی آخری چو الیوسین کڑی تک پہنچ کر آخری گاؤں کے روپے سے ایک روپس خریدی جس کو village on wheels کہلاتا من کر وہ اتنا خوش ہوتا تھا جیسے وہ خود جان عالم کا بھتیجا ہے۔ اس جان عالم کا بھتیجا جس کا ملک ویلز لے اور ڈیوڈی کی کوچ کے پہیوں کی رگڑ سے ترش تر شا کے سات سمندر پار کے جگمگاتے تاج کا کوہ نور بن چکا ہے۔ اور وہ ملک جس پر کبھی غروب نہ ہونے والے آفتاب کی کرنیں دو سو سال سے مستقل برس رہی ہیں جن کی تہذیب سے کھیت اور دامیاں سونا اگلتی ہیں اور انسان سڑک کے کنارے پٹرلوں پر سوتے ہیں اور اکثر وہیں مرنے بھی ہیں۔ اور ”مدلانڈیا“ کے گود پوش والی دیوداسی کے پانزیب کی جھنکار گرجی اٹھتی ہے۔

ریشا چپ چاپ جے فیئر کے نئے رقص کے متعلق سوچ رہی ہے۔ کیپٹن عثمان کی کوکھی میں ریڈیو گرام بجا رہا ہے۔ ایف۔ کیسا نووا کا آرکسٹرا اور اس کے ساتھ ساتھ بنگلے ملک کا گیت۔ پران چاہیں۔ نیانا نہ چاہیں۔ پران چاہیں۔ کیپٹن عثمان، جنہیں اپنی خوبصورتی اور قابلیت کی وجہ سے مغالطہ ہے کہ سارے جہان کی لڑکیاں ان پر ایک ساتھ جان دیتی ہیں۔

کیپٹن عثمان آئی۔ اے۔ ایم۔ سی۔ میں ہیں۔ ایک دفعہ ایکٹنگ میجر رہ چکے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت جلد لفٹننٹ کرنل ہو جائیں گے جو یقیناً بہت بڑی بات ہے کیونکہ میڈیکل کالج سے نکلے ابھی پورے تین سال بھی نہیں ہوئے۔ ان کے باپ بھی فوج میں تھے اور دادا بھی اور پردادا بھی۔ ان کا راجپوت خاندان جان لارنس کے زمانے سے دولت انگلیشیہ کا جاں نثار و وفادار رہا ہے اور پنجاب میں ستلج کے کنارے کنارے ان کے بہت سے چک ہیں جو غالباً انہیں بھی کسی پرچے پر خون سے لکھے ہوئے الفاظ میں ان کے پردادا کی غدر کی فوجی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں ملے تھے۔ (ستلج کے وہ کنارے جہاں لاؤ کے گرد اور بیروں کے نیچے اور چوپال میں بانسریاں بھتی ہیں اور احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کی قسم کے رومان جنم لیتے ہیں۔) کیپٹن عثمان دلاور سوراؤں کی اسی ندرخیز سرزمین کے فرزند ہیں۔ وہ جاپانی شہنشاہیت اور فسطائیت کے خلاف نہایت تن دہی سے سرگرم عمل ہیں۔ نہ خیموں کو تندرست کر کے دوبارہ محاذ پر بھیجتے ہیں اور اپنی یونٹ کی سرخ ہونٹوں اور نابھی والوں والی ویلفیئر فورسز سے فلرٹ کرتے ہیں۔ ان کا بیٹا بھی اپنی خاندانی بہترین روایات ملحوظ رکھتے ہوئے اُندھ بیچیس سال بعد بین الاقوامی سیاست کی لیبریری میں تیار شدہ کسی نئی انم کے خلاف لڑے گا اور فلرٹ کرے گا۔

تو آپ کیپٹن سے ملیں گے؟ جے فیر قشر لٹ لائیے۔ یہ آپ کے ساتھ بہترین پونکاکریں گے اور مدد میا اور فوکس ٹروٹ۔ اگر آپ کو واپس گھر لوٹنے میں خنکی کی وجہ سے نہ کام ہو گیا ہو تو یہ آپ کو ہسپتال سے دن میں پندرہ

مرتبہ فون کر کے یقین دلائیں گے کہ آپ کے نکاح کی وجہ سے انہیں فکر کے مارے رات بھر نیند نہیں آئی اور آپ رات بھر چاندنی میں رس بھری کی خوشبوؤں کے خواب دیکھتی رہیں گی۔ پران چاہیں، ممکن ہے اخلاقی جرات کی کمی کی وجہ سے نیناد چاہتے ہوں۔ اسی وجہ سے طلعت پورسٹ وار ورلڈ کے مضامین کے ڈیجر پر پڑھی سیٹھی رہتی ہے۔ یہ بھی بقول شکنتلا ایک بڑا اہم سائیکلو جیکل نکتہ ہے۔ لہذا اے میرے گلغام سب لیوٹ، ہم سارے کے سارے رات کے کمرے میں چھپی ہوئی اس مال پر رداں ہیں۔ ایک دوسرے کی نظروں سے بچتے ہوئے میں اور تم — اور ریشا میری بہن اور پیکر ڈمیری کار — اور ہمارے پیچھے پیچھے ان کہی چھیلیوں اور جانے بوجھے سوالیہ نشانوں کا عظیم انسان کارواں دے دے قدموں سے گرتا پڑنا چلا آ رہا ہے۔ ہم میں اتنی مہمت نہیں کہ مڑ کر اسے دیکھ سکیں۔ ہم اس سے چھپنے کے لیے مے غیر کے نیلا گوں دھندلوں میں پناہ لیتے ہیں۔ بال روم کے شیر لیس پڑکھنے آسمان اور چمکیے ستاروں کے نیچے، اپنی باندی پر سے جھک کر دیکھیے زندگی کا یہ مارچ پاسٹ۔ تازہ ڈانس نمبر کے یہ اداس نغمے۔ ریشا نگین برقی قمقموں، جاپانی قندیلوں اور کاغذی رہنوں کے رقصاں و لرزاں سائے تلے آہستہ آہستہ تاج لہری ہے، نپے تلے تھکے تھکے قدموں سے۔ آج فتح برسن کے جشن کی رات ہے۔ ڈانس کے دوسرے نمبر کے لیے اپنے پارٹنر کا انتظار کرتے کرتے ٹیر لیس کے ریلنگ کے سہارے مجھے مدھم سی نیند آ جاتی ہے۔ یہ ٹھنڈی ریلنگ کتنی پرسکون جائے پناہ ہے۔

ہم لوگ !

بیچارے !!

قصہ شر

پارٹ ون - کشتی پر

جیسو مرایا !

ہم - جیسو مرایا !! (بالکل ولایتی ہو)

اوہ - ادھر دیکھو - چھتر منزل کے نیچے نیچے درختوں کے سائے میں گومتی

کارنگ کتنا گہرا سبز نظر آ رہا ہے -

تمھاری آنکھوں کا رنگ بھی تو ایسا ہی ہے - دھندلا سا سبز اور چھلکتا

ہوا جیسا -

ہوں -

کیسی - میرا مطلب ہے کہ - نفیس بات ہے (دراصل تجھے اس سے

بہتر اردو بولنی نہیں آتی -)

بہت نفیس - (افسوس کہ تجھے بھی نہیں آتی -)

کیونکہ ہم دونوں ہندوستان کے ہو کر بھی ہندوستان کے نہیں ہیں -

نہیں ہیں !
کس قدر مٹی بات ہے یہ !

بے انتہا -
غروب آفتاب کی خاموش قرمزی موسیقی کے ساتھ ساتھ کشتی کھینا تھیں
پسند آ رہا ہے ؟

خاصا - (اے میرے گیتوں کے ملاح !)
اجازت دو کہ عرض کروں کہ کاش شفقت کی سرخی پانیوں پر چھپتی رہے -
شام کی دبیز ہوائیں تمہارے خوبصورت بال اسی طرح پریشان کرتی رہیں اور یہ
کشتی ان نامعلوم آبی راستوں پر یونہی رواں رہے - (ڈیمز کی لہروں پر میں نے اہمی
افلاطون کا بہترین انگریزی ترجمہ کر دیا تھا -)
میرا خیال نہیں -

اور جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ ۱۹۴۰ء کے جاڑوں میں سے فیروزہ بال روم کی
ایسٹج پر سفید پھولوں کا تاج پہنے جو بی اطالیہ کے ساحلوں کا قص کرتے دیکھا تھا
(جہاں تمہارے کالج کا ڈرامہ ”ماہی گیری لڑکی - پریل“ کھیلا جا رہا تھا) اور پھر
پچھلے ہفتے جب تم پھولوں کے ڈبے سنبھالے کینٹین سے نکلی کراچی کار کی طرف بڑھ
رہی تھیں -

بے حد طویل عبارتیں نہ بانی کہہ ڈالتے ہو - ذرا مختصر افلاطون میں اپنا مطلب
بیان کرو -

ار - میں یہ کہہ رہا تھا کہ چھتر منزل کے سائے دریا پر پھیلتے جا رہے

رہے ہیں اور میں بے انتہا خوش قسمت ہوں۔ ظاہر ہے —

شپ — شپ — شپ — شپ !

تمہیں میرا شہر کیسا لگا ؟

اچھا ہے — خصوصاً نیوانڈیا کی بالکونی اور امبیٹڈ۔ یہ پرسکون ندی
اور وہ دوسرے کنارے پر بندھی ہوئی ملیسی ناؤ کا سلاٹ اور اس کے سائے میں
چھپا ہوا پھونس کا گھر —

جناب ! وہ ہمارے ماں کا بوٹ کلب ہے۔

تمہارے ماں کا ؟

جی یونیورسٹی کا ہماری۔

اور وہ بے حد شاندار سا چلے ؟

موتی محل برج۔

اسی پر سے رومان خوابوں کے گیت گاتا ہوا گزرتا ہے !

معلوم نہیں۔

شپ — شپ — شپ — شپ — چاروں طرف یہ سائے طویل ہوتے جا رہے

ہیں۔ فطرت کے یہ مبہم، بے معنی سے اشارے۔ ایک نظم سونگ — ہم تین دوست

ہیں۔ میں اور میرا سایہ اور زرد چاند — شفق تو کی رات میں جب ستاروں

کے دیوتا فوجی کو کا مقدس برہم بجاتے ہیں تو میں پیری کے نیچے بیٹھ کر یا شہیا

کے چادریں کی سرخ شراب پیتا ہوں۔ لیکن چاند اور میرا سایہ شراب نہیں پی سکتے۔

پھر میں شام کو رات کے مندر میں واپس چلا آتا ہوں — ہم تین دوست ہیں۔ یہ

جاپانی نظم تھی۔ چینی نظم سناؤں یا روسی !

اُف ، خدا کے لیے چپ رہو۔

مشپ - چپ - مشپ -

کیا سوچ رہی ہو ؟

کچھ نہیں۔ ارے یہ کون ؟

کہاں — ؟ آنکھوں کے پوٹے بھاری ، ہونٹوں پہ نشے کی دھاری ، یہ

کون آیا — یہ کون آیا ؟

بے حد لغو ہو !

لیکن اس طرف اتنی دلچسپی سے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس پھونس کے گھر کے

نیچے سے کوئی رد مال ہلا رہا ہے۔ ہوگا کوئی۔ وہ ہسپانوی نغمہ سنو جو سترھویں

صدی کی —

ارے وکٹر — قطعی وکٹر ہے — دیو آؤٹ کر رہا ہے بیچارہ اتنی دیر

سے۔

کون ہیں یہ بزرگ ؟

وکٹی — وک — ٹر — ہیلو — شی — شی — شو — اس نے

تمھاری آواز نہ نہیں سنی — ہسنہ !

وکٹی — آئی سے — شو شو شو (وہ بھی سیٹی بجا رہا ہے۔ بہترین

سیٹی بجاتا ہے۔)

آخر یہ کون صاحب ہیں جن سے آپ اتنی بے تکلف ہیں۔

وکر ونڈ اجیت کمار سنگھ — لائبریری میں میرے ساتھ پڑھتا تھا۔
 بہر حال ایک محقر ڈکلاس ایگلو انڈین لڑکے کا تھیں اس طرح ورمال ہلانا
 میری نظروں میں سخت نامناسب اور عجیب بات ہے۔
 کیا فرمایا آپ نے — محقر ڈکلاس — جناب والا وہ سر جہا راج سنگھ
 کا خالص سگا —

فہ —

شپ - شپ - شپ - شپ -

فہ — شوہ —

لالہ !

فرمائیے۔

میں تم سے صمیم قلب سے معافی چاہتا ہوں۔
 اور میں آپ کو اسی صمیم قلب سے معاف کرتی ہوں۔
 اچھا تو باتیں کرو۔

گو مٹی کے پانیوں میں اڑنے والے نیلے پرندے دیکھے ہیں تم نے — دجزل
 قسم کے topic پر گفتگو کی جائے گی۔

ہم — ذوق کی بھیل میں دیکھے تھے — اور سارس — اس کے علاوہ بطخ
 بھی نہایت عمدہ اور مفید پرندہ ہوتا ہے۔
 کس قدر زبردست بور ہیں آپ۔

لالہ !

ارشاد !
 کبھی تم نے یہ بھی غور کیا (قطع نظر اور باتوں کے) کہ محبت کتنا شیریں، خوبصورت
 اور پیارا خیال ہے۔

رہش۔ (بطخوں سے محبت پر آپ خوب آہنچ گئے۔)
 لالہ ! ایسے خوبصورت وقت میں (جب کہ آئینہ آب پر، موجہ شاداب پر،
 سایہ عقیقہ پر، منظر شب تاب پر۔۔۔ ہے مری کشتی رواں اور میں ہوں نغمہ بار)
 اگر تم نے اپنی فلسفیانہ زندگی چھوڑ کر تھوڑی دیر رومان کی باتیں نہ کہیں تو یقیناً
 جانو ان تمام چیزوں کے ساتھ (جن کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے) سخت زیادتی ہوگی
 (لہذا محبت کے متعلق اپنی رائے مفصل بیان کرو)۔

روٹ۔

ایں۔

ہوہ۔

(جاپانی زبان میں بولتی ہو) تو یہ افواہ درست تھی کہ آپ انتہا سے زیادہ
 میٹر آف فیکٹ ہیں۔

قطعاً درست ہے۔ تم سے کس نے کہا تھا۔

عاف کہہ رہا تھا بچارہ، حالانکہ اس کا خیال تھا کہ یہ اس کی پسند کی
 منگنی ہے۔

پسند کی منگنی ! اس سے زیادہ تو کاروباری اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی، جیسے
 دنیا کی اور بہت سی باتیں ایک خالص پروگرام کے ماتحت چل رہی ہیں : رات کا

سونہ، صبح کی چائے، دوپہر کے یونیورسٹی کے لیکچر، شام کو کافی یا دوس۔
اور اس وقت تمہارے ساتھ یہ کشتی رانی !

ایس ! لیکن اس رومان آفریں —

اس سے آگے پہنچ کر سارا رومان کوچ کر جائے گا —

پر اگر تم میرا یقین کرو —

تم جیسوں پر یقین کرنا کس — گدھے نے بتایا ہے۔

میرا خیال ہے — تمہیں اپنی زبان کی طرف توجہ کرنی چاہیے۔

بہر کیف آپ اطمینان رکھیے — میں دہلی کلاٹر ملز کے کپڑے کے کوپنوں اور

پریسنگ مکھن کے ڈبے کے علاوہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔ لیکن آپ اور عارف اور

آپ کے سارے قبیلے والے گلزار شفق کی سرخوئی اور شبنم کے گیت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

اور اگر اس وقت تمہیں بتاؤں کہ میں تم پر بالکل — مرتا ہوں تو تم کیا کرو گی؟

میں فوراً یہ کشتی الٹ دوں گی تاکہ ڈوب کر تم زیادہ آسانی سے مر سکو۔

کشتی الٹ دو گی۔ خدا کی قسم — افوہ غالب نے یا شاید ذوق نے خوب کہا تھا:

احسان ناخدا کا اٹھائے مری بلا

کشتی خدا پہ چھوڑ دوں، لنگر کہ توڑ دوں

اس کے علاوہ جذبہ بی کہتا ہے :

جب کشتی ثابت و سالم تھی

ہائے اللہ ! کس قدر برجستہ اور باموقع شعر پڑھتے ہو، واقعی !

قلیلات - تسلیمات - عرض کیا ہے کہ — گیتوں کا طوفان اٹھا ہے اپنی بیٹا

تیز کرو۔۔ یعنی غور کرو کہ ان الفاظ میں طوفان — ریڈیو آرکیٹرا اور شاعر کے
 جنابات کی باہر پچھلش کو کس خوبی سے پیش کیا گیا ہے — محبت کے فلسفے
 پر نوٹ لکھتے ہوئے اس دوسرے شعر میں شاعر کہتا ہے کہ —

خدا کے لیے تم چپ بھی ہو گے یا نہیں۔ حجت۔ حجت۔ !
 واللہ۔ خوب! حجت کا افسانہ اور ان بسوں سے — خوشاں زبانی،
 زہے آن بیلنے!

خوشاں — راز بھی بھی بڑے پایہ کا شاعر ہو گا ایک دن علی گڑھ
 میں میرا کلاس فیلو تھا — اور سنو — کہتا ہے کہ — ارے تم تو واقعی
 اس قدر گلزار ہر ہی ہو جیسے —

اتنے بکواسی ہیں آپ خدا کی قسم — اب میں سچ حج روزا شروع کر دوں گی۔
 اچھا تو پھر اوٹھارے مطلب کی کاروباری باتیں کریں۔ بھی مارکیٹ میں
 پچھلے تین گھنٹے میں دکھنی کپاس اور خاندیش کی مونگ پھلی ساڑھے سینتالیس
 فی صدی کے بھاؤ سے گر گئی — اور کنیش فلور ملز کے پریفرنس شیرازہ —

شپ۔ شپ۔ شپ۔ شپ۔

ہائے اللہ اگر میں تمہیں قتل کر سکتی — تم اتنے بڑے کیوں ہو؟

اور تم اتنی پیاری سی گڑیا کیوں ہو؟

کاش تم میں عقل ہو۔

کاش تم اتنی عالم فاضل نہ ہو تیں — (دورنہ میں تم سے ضرور شادی
 کر لیتا)۔

پارٹ ٹو — کینٹین میں

جیسو مرایا !

ہا — جیسو مرایا !!

سیلما — چاندنی رات کا گیت ، موسمِ گل کے نغمہ زادوں کی شراب —

اندہ اسجاؤ — میری نیلی آنکھوں والی سینوریتا — اور آج کی رات کو

محض آج کی رات سمجھو۔

سیلما — تمہیں کون سی شراب پسند ہے — اسکو بچ — شیری —

ورمونڈ — کوک ٹیل بناؤں ؟

دونٹ مانند اسے لیں شیری۔

اور آپ — مس — ار — مس۔

— لالہ رُخ —

مس لالہ رُخ — دونٹ یولائنگ ڈو —

نیوٹھینکس ، کرنل — آئی ڈونٹ ڈرنک — اوہ۔

اوہ —

— فرالین سیلما مارینا فرٹز برگ —

مس لالہ رُخ —

ڈیلائیڈ ٹو میٹ یو !

یقین جانو ہم بہترین دوست ثابت ہوں گے۔

سیلما مارینا — کیسا رویا نٹیک اور چھپسیوں جیسا نام ہے میری انتہائی
 ٹوٹی پھوٹی قرینچ کا سارا زور لگا دینے پر کبھی تم محض مسکرا رہی ہو۔ یہ بات ٹھیک
 نہیں۔

تمہارے کیوشیکس کا شید بہت پیارا ہے۔

ناج کے تہوار کے بعد بھی ہم ملا کریں گے نا۔ تم لکھنؤ ہی میں رہتی ہو نا؟
 لاپلاز میں — مجھے تم بہت اچھی لڑکی معلوم ہو رہی ہو۔ حالانکہ عموماً غیر ملکی مجھے
 فدا نہیں بجاتے کیونکہ ہم لوگ سخت قوم پرست ہیں۔ میرا بھائی بھی تمہیں بہت پسند
 کرتا ہے۔

تمہارا بھائی؟

ہاں بہترین لیڈی کلر ہے۔ اس کیفٹین کا ٹھیکہ اسی کے پاس ہے۔
 میں اس سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔

— سیلما — آج کی رات — آج کی رات — کتنی بے وقوفی کی
 باتیں ہیں یہ ساری کی ساری — جب کہ — جب کہ خاموش ہوا پام کے پتوں
 کو آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے اور باہر سبز آسمان پر روپے ستارے جھللا رہے ہیں۔
 اور کل جب میں یہاں سے سیکٹرول میں دوڑ جا چکا ہوں گا یہ پتے اور یہ ہوائیں یونہی
 گاتی رہیں گی۔

سیلما!

ہمل —

کیا سوچ رہی ہو؟

وہ کون ہے ؟
 میرا منگیتر۔ آفیشیل فیانے —
 آفیشیل فیانے —
 یپ —

اور وہ دوسرا ؟

وہ کمال ہے — انتہائی باتونی آدمی — اور یہ میں ہوں — لالہ رُخ
 دیر اصل یہ نام نہیں ہے لیکن چونکہ اس نام میں رومان زیادہ نظر آتا ہے اس
 لیے میں اپنے آپ کو یہی کہلوانا زیادہ پسند کرتی ہوں — اور تم ! — محض ہنگرین
 سی بال روم ڈانس — اور — یہ اپریل کی رات ہے — اور ہم کینٹین
 کے باہر پائسن کے سائے میں سبز بید کی گرسیوں پر بیٹھے انتہائی بے معنی باتیں
 کر کر کے بے حد خوش ہو رہے ہیں — اور مہلی مٹی کے جشٹن بہاراں کی شام کو تم
 نیلے ڈیفنوب کے سبزہ زاروں کا ناج دکھلاؤ گی جس کے لیے تم کو ساڑھے
 تین سو روپے جنگی فنڈ میں سے دیے جائیں گے — سیما —

ہاں !
 کیا خیال ہے تمہارا ؟
 بہت خوب —
 تمہیں میرا منگیتر پسند آیا ؟
 نہیں —
 اور کمال ؟

نہیں۔

میرا بھائی ؟

وہ بھی نہیں۔

ادہ۔ پھر تمہارے لیے کیا کیا جائے ؟

کچھ نہیں۔ شکریہ !

تمہیں ہندوستان کے لڑکے اچھے نہیں لگتے ؟

بہت اچھے لگتے ہیں کیونکہ بہت ویل ڈر سیڈ ہوتے ہیں۔ بڑی عمدہ انگریزی بولتے ہیں۔ بے حد اسٹائل سے پیار کرتے ہیں۔ انتہائی احمق ہوتے ہیں

لیکن انتہائی عقل مند نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تمہارے ملک کے لڑکے ایسے نہیں ہوتے۔

نہیں۔

— فرالین سیلما !

ماں۔

تمہاری ماں کون تھی ؟

اس کنٹرکٹ میں میری ماں کا ذکر بھی ضروری ہے۔

نہیں، یونہی پوچھ رہی ہوں، ذرا ہمدردی۔

اچھا، شکریہ۔ — بوڈاپسٹ میں ٹوپیاں بیچتی تھیں — مرگئی —

ادہ، چچ، چچ، چچ — اور باپ ؟

اس سے بھی ہمدردی ہے ؟ وہ برلن کے ایک لوہے کے کارخانے میں فورمین

تھا۔

تازیوں نے مار ڈالا؟

نہیں — خود ہی مر گیا — خود کشی کر کے۔

اوہ - ہاؤریٹی سیٹھ — برلن واپس جانا چاہتی ہو؟

نہیں۔

کیوں؟

دہلی کے ٹاٹ کلب ابڑ چکے ہیں اور یہاں روزانہ ٹاٹ کلب قائم ہو رہا ہے۔

تو تمہیں ہمارا ملک پسند ہے گویا!

بہت۔

— سیلما —

تم نے پولٹ گوڈڈ اور این - شیرمین کو دیکھا ہے؟

نہیں — تم نے دیکھا ہے؟

ہاں — دہلی کے روشن آرا کلب میں۔ دونوں ہالی ووڈ سے ہندوستانی فوجوں کو

محفوظ کرنے کے لئے آئی تھیں۔ (جی چاہتا ہے بیورلی نکولس کو بکڑ کر رکھا جاؤں)

بیورلی نکولس کون؟

ارے تم بیورلی نکولس کو نہیں جانتیں۔ اس نے ہمارے متعلق ایک سخت بیہودہ

تاب لکھی ہے۔

اچھا — میں کتابیں نہیں پڑھا کرتی۔

ارے — پھر کیا کرتی ہو؟

کچھ نہیں۔

اوہ!

— ہلو۔ چکو۔ بیچ بیچ بیچ۔

سیلما یہ کس کا اتنا سوٹ بچہ ہے۔

میرا۔

تم — اے — را؟

ہاں۔ کوئی اعتراض؟

یقیناً نہیں۔

(تم ایک زبردست سماجی انقلاب کی قائل ہو۔)

— بھئی اللہ — داتھی — افوہ —

کیا ہو رہا ہے؟

فلسفہ حیات کی تفسیر۔

اہم — کب سے؟

یہ میں ایک جدید طرز کی نظم لکھ رہی ہوں (ایک سفید نام بال روم ڈانسر

سے متاثر ہو گئے)۔

فرمائیے۔

یہ — آ سیلما مارینا — آج کی رات (جسے محض آج کی رات سمجھ)۔

اے اجنبی عورت۔

ٹھیکرو۔ اس رفتار سے بہت دیر لگے گی۔ لکھو:

یہ دُنیا ایک کینٹین ہے ،

یا میونسپلٹی کا دفتر

اور زندگی

ایک اُرچی کنٹریکٹر کے بھاری ٹرک کا گھومتا ہوا پہیہ

گوا لیا دہ پوٹری کا

نحو بصورت شکر دان جس کا

جینی کارو عن بہت جلد اتر

جاتا ہے -

چنانچہ میں چپ کھڑا ہوں زندگی کے موڑ پر

اور اُمری جان مرے پاس دریچے کے قریب

یہ ڈرائنگ روم ہے

اور یہ پائپ ہے مرا

اسے اجنبی عورت

— ٹھیکرو - یہ تو تم چہرا رہے ہو صفا -

چپ چاپ سنی رہو - آگے لکھو :

ساتھی کی اک نگاہ پہ لہرا کے پی گیا -

رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا -

ارے میاں گہرا کے پی گیا - اجی ٹھکرا کے پی گیا -

یہ راشد کی مشہور غزل ہے -

اچھا آپ میری جان پر کرم کیجیے۔
لیکن مجھے آپ سے کچھ عرض کرنا ہے۔

ارشاد!

کیا آپ واقعی عارف سے، اس نامعقول سے، جس کے آگے سارے کافی
ہاؤس ڈینڈی پانی بھرتے ہیں، (اور جو بے انتہا شائل سے ہکلا کر پائپ پیٹے
ہوئے خالص ولایتی انگریزی بولتا ہے) شادی کر رہی ہیں؟

جی (اور کل تک آپ اس کی ترجمانی اور نمائندگی فرما رہے تھے)۔

لیکن —

اچھا کمال صاحب ایک کام کیجیے۔ یہاں سے تشریف لے جائیے فی الحال —
اوہ لالا۔ یہ کتنے خوش رنگ پیارے سے پھول ہیں۔ کہاں سے خریدے؟
شکریہ۔ ہمارے ہاں پھول خریدے نہیں جاتے۔ میرے منگیتر نے اپنے باغ
سے صبح بھیجے تھے۔ (ہماری دکانوں میں صرف مصنوعی پھول بکتے ہیں)۔

اوہ — تمہارا منگیتر — آفیشیل فیانسے آئی مین۔

ہاں — اس سے طو۔ دفتر سے آکر صوفے پر بے حد اکتایا ہوا سا بیٹھا ہے۔
جوائنٹ ججسٹریٹ ہے یا اسی قسم کا کوئی بڑا سا کام کرتا ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں
میں مجھ پر ایسا رعب ڈالتا جاتا ہے جیسے مجھ سے شادی کر کے مجھ پر بڑا عظیم انسان
احسان کیے دے رہا ہے۔ سلی گوس۔

ہماری منگنی کی اطلاع گزشتہ چھینے آفیشیل طور پر اخباروں میں چھپ چکی ہے
لیکن ہم نے اب تک بہت کم باتیں کی ہیں۔ (موسم اور سنیما کے متعلق)۔ ہم دونوں

اپنی اپنی جگہ پر بہترین قسم کے منگیتر ثابت ہوئے ہیں۔ کرکیٹ اور مثالی۔ وہ ستر نیں کی رفتار سے کبھی ڈرائیو نہیں کرتا۔ پن اپ گرنز کی تصویروں سے کوئی دل چسپی نہیں۔ کچیز کو موویز یا فلیکس کہتے اسے نہیں سنا گیا۔ چار آنز پوائنٹ سے بھی برج نہیں کھلتا۔ صبح بہت جلد اٹھ جاتا ہے۔ سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے ہرگز نہیں بناتا۔ (اور کمال صاحب جو کچھ اس کے متعلق بیان کرتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔) یس اور نو کوپ اور نوپ نہیں کہتا۔ ہم دونوں کا جب کسی دوسری جگہ پر ملنا ہو جاتا ہے تو دونوں فوراً ازراہ اخلاق تھوڑا سا شرما کر دوسروں سے مختلف بے حد ضروری باتوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ (اسی لیے میں تم سے یہ باتیں کر رہی ہوں۔)

مجھے انتہائی مسرت ہوئی تمہارے منگیتر سے مل کر۔
اور یہ کمال صاحب ہیں۔ آپ چار پانچ لڑکیوں سے بیک وقت عشق فرماتے ہیں اور ہر عیسے منٹ پر شعر پڑھتے ہیں۔
شعر!

ہاں! ہمارے ہاں کے ڈون جوں شاعروں کے حوالے پہلے دیتے ہیں اور اپنا مطلب بعد میں بیان کرتے ہیں۔

اس کم عمری میں خاصا وسیع تجربہ رکھتی ہوئے یہ بھی تمہارے ملک کی خاصیت ہے۔
دراصل ہمارے خطہ زمین کی گرم ٹراپیکل آب و ہوا کی وجہ سے —
قطعی —

تم لپ شک کیوں استعمال کرتی ہو؟

تم بھی تو —

لیکن میں محض ایک بال روم ڈانسروں - ہمارے ہاں کوئی اعلیٰ خاندان
رٹکی میک آپ کا استعمال نہیں کرتی -

تم نے زندگی کو جمالیاتی احساسات سے علیحدہ کر دیا ہے اور ہم جذبات و
احساسات پر مرتبی ہیں - آرٹ اور خوبصورتی کے پرستار ہیں - (تم نے لکھنؤ آرٹ
سکول کی نمائش دیکھی ہوگی -)

یقیناً - یہی وجہ ہے کہ تمہارے کافی ہاؤس آرٹ اور خوبصورتی کے پرستاروں
سے پُر ہوتے ہیں -

اوہ سیلما ، نہ جانے تمہارے کیسے خیالات ہیں - تمہارے علاوہ کوئی
اور غیر ملکی ، خصوصاً یہ امریکن ، جب ہم سے ملتے ہیں ایک ایک چیز کی تعریف میں
بس مرے جاتے ہیں ہماری رنگ برنگی ساریاں ، ہمارے سیاہ لمبے لمبے بالوں میں
سجے ہوئے کنول اور یاسمین کے پھول ، ہمارے مانی پوری رقص - وہ کہتے
ہیں کہ چغتائی کے نقوش اور اجماروں میں جان پڑ گئی ہے - (اس اتوار کو
ایسٹ امینڈولسٹ فریڈنیٹ کی میٹنگ میں چلنا - تمہارے خیالات ٹھیک ہو
جائیں گے -)

اور یہ میرا بھائی ہے - فوج میں تھا لیکن جب ہمارے یہاں ٹھیکوں کا کام
حد سے زیادہ بڑھ گیا تو وہ کسی ترکیب سے ملازمت چھوڑ کر گھر آ گیا - بڑی بڑی
بجارتی اور قومی فائدے کی اسکیمیں ہیں اس کے دماغ میں - علی گڑھ میں میڈیکل
کلج قائم ہو جانے پر وہاں ایک کافی ہاؤس کھولے گا (تا کہ ملت کے فرزندوں

کراسٹیشن جانے سے نجات ملے) اور پھر اعلیٰ کاروباری تجربہ حاصل کرنے کے واسطے امریکہ جائے گا۔

پارٹ تھری — فائنل

اپنے نیلے پردوں والے دریچے میں سے صرف ایک بار اور جھانک لو — آخری بار — پھر جب تمہیں غند آجائے گی اس وقت ساحل بہت پیچھے رہ چکا ہوگا۔ اس گیت کی لہریں تمہیں فراموش کر دیں گی جن کے سہارے سہارے بہار کا چاند آسمان کا چکر لگاتا ہے۔ آہستہ آہستہ قدم رکھو۔ سمندر کی موجیں ریت پر اپنے نشان چھوڑتی ہوئی گزر رہی ہیں — بہت دور تمہاری خوابوں کی کشتی سمندر کی ایک اجنبی کرخت چٹان سے ٹکرا کر ڈوب چکی ہے۔ اس کے ٹوٹنے کی آواز، لہروں کا غمگین نغمہ، اب بھی تمہیں سنائی دے رہا ہے۔ دھڑکیں کے ان نیلے بادلوں کے پرے سے کوئی تمہیں پکار رہا ہے۔ آخری بار انھیں جواب دے دو۔ پھر وہ آوازیں واپس چلی جائیں گی۔ اپنا دریچہ بند کرنے سے پہلے سوچو، وہ لمحے، وہ گیت جو تم انھیں نہ دے سکیں۔ وہ بہت آگے نکل چکیں۔ ان کا پیچھا کرنے کی تم میں ہمت نہیں۔ اس شکست کا خیال کرو جو ایک شاہین کو ایک اونچی چٹان پر سے گرتے ہوئے محسوس ہو سکتی ہے۔ غم نہ رہیں کہاں کھد گئیں جن کے سبز کناروں پر مسروق کے جوان اور خوبصورت چہرہ اپنی رنگین بانسریاں بجا یا کرتے تھے اور جہاں پہاڑیوں کے پرے سے بوہیلی سلوآروں کی جھنکاریں سنائی دیتی تھیں۔ اپنی آنکھیں اپنے لب بند کر لو۔ اپنی پگڈنڈیوں پر سے اترتے ہوئے ہم نے چٹانوں کے اونچے ایوان

سجائے تھے۔ ہم ان چٹانوں پر کھڑے تھے لیکن ہمارے پیرچم مخالف طوفانی
 ہواؤں کا مقابلہ نہ کر سکے اور آج جب کہ تم زرد بالوں اور نیلی آنکھوں والے
 سیگفریڈ سے بہت دور ہو جو تمہارے دریکے کے نیچے آتا ہے وہ سیگفریڈ ہوتا
 ہے۔ سیلما، سیلما —

— فوہ — ہل — وہ سستی سی دوغلی چھوڑ کر ہی جو ہماری کینٹین
 کے ہندوستانی کنٹریکٹر کو پرنس کے اسٹال پر چو کو بار نہ بیچتی ہوئی مل گئی تھی۔
 ہنری! مجھے پچاس روپے چاہئیں۔

اہم — نہیں دے سکتا۔

ایک ہفتے سے مانگ رہی ہوں۔

میرے پاس نہیں ہیں۔ اپنے کالے ہندوستانی دوستوں سے لو۔

تم بے حد سوڑ ہو۔

اور تم شیطان کی سگی بیٹی — فانی فانی — فو — (جنگ ختم ہو گئی۔)

ہم فاتح ہیں۔)

— فانی — فو — جنگ ختم ہو گئی — خدایا تیرا شکر۔ آج شام کو

ہم چراغاں دیکھنے حضرت گنج چلیں گے۔ اور پھر امبیڈر۔

افوہ — کتنے خوش ہیں ہم آج۔ اور سیلما تم جرج کے لیے اب تک تیار

نہیں ہوئیں۔ چھاؤنی کی طویل اور چمکیلی سڑکوں پر پولیس کی گارڈ خاموشی سے

ٹہل رہی ہے کیونکہ گورنر شکرانے کی سروس کے لیے سینٹ پال جانے والا ہے اور

ہمارا جہانگیر آباد کی لمبی سیاہ کار کسی انتظام کے سلسلے میں ان سڑکوں پر سے بار

بارتیزی سے گزر رہی ہے اور ان کی کوٹھی کے پھاٹک میں سے نکلی کر کلمتہ لامارٹیز
 کے سیاہ پوش لڑکے قطار در قطار سیٹیاں بجاتے چرچ جا رہے ہیں۔ لفٹ رائٹ۔
 لفٹ۔ رائٹ۔ او خدا۔ ہماری آزائش کا صبر آزا زمانہ نصرت کے ترانے
 گاتا ہوا آج آخر ختم ہو گیا۔ ظلم اور تشدد کی اندھیری طاقتوں کے طوفان کے مقابلے میں
 ہم اور ہمارے ساتھیوں نے کتنی عظیم الشان قربانیاں پیش کیں، مصائب کا کیسی
 بہادری اور سکراہٹ کے ساتھ سامنا کیا۔ اور کیا مضائقہ تھا جو ہندوستان
 کے ایک پست سے طبقے کے چند لاکھ نفوس (جو صدیوں سے چادل کھا کھا کر زمین
 پر ریٹکتے آتے تھے اور جنھیں ٹن فروٹ کھانے کی تمیز نہیں تھی) سڑکوں پر لیٹ
 لیٹ کو مر گئے یا جنھوں نے دہلی کلاتھ ملز کے دروازوں پر بلوے کر کے غیر ملکیتوں کو
 کتابیں لکھنے اور کمیونسٹوں کے گونا گوں تفکرات میں اضافہ کرنے کا موقع ہمیں پہنچایا۔ یہ
 ہماری طرف سے آزادی اور جمہوریت کی قربان گاہ پر ایک معمولی سی پیش کش تھی جسے
 اکابر ثلاثہ نے نہ راہِ لطف و کرم قبول فرمایا۔ ہم اپنی کوششوں میں اپنے ساتھی
 ملکوں سے پیچھے نہیں رہے۔ دیکھو ریڈیو اسٹیشن، کونسل جمیئر، گنج کی اونچی
 اونچی عمارتوں اور ہماری موٹروں پر ہماری ساتھی قوموں کے پرچم کس خوبصورتی سے
 لہرا رہے ہیں۔) یونین جیک اپنی کار کے ریڈی ایٹر پر لگانے کے لیے تم بھی خرید
 لو۔ صرف ساڑھے چار آنے کا ہے۔) ہنہ۔ تم۔ تم جو ہمیں چین اور روس
 کی عورتوں کے کارنلٹ سناتے ہو۔ چین اور روس۔ چین اور روس۔
 کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مہقوق۔ دن۔ دن اور رات۔ رات رات بھر
 ریڈ کر اس پارٹیوں کے ساتھ بعض مرتبہ حرف ٹن کے پھلوں اور کریم کرکیڈز پر

گزارہ کر کے ہم نے محاذ پر بھیجنے کے لیے اونی چیزیں، مٹھائیاں اور تحفوں کی پارسلیں تیار کیں۔ اے۔ آر۔ پی۔ کی ریہرسلوں کے بعد گورنمنٹ ہاؤس کی پارٹیوں کا انتظام کیا۔ ہفتے میں صرف ایک بار سینما دیکھا اور باقی کے روپے سے رسالے اور کتابیں خرید کر ہسپتالوں میں بھیجیں۔ اس کے علاوہ بنگال ریلیف کے لیے ٹیکور اور شا کے ڈرائے اسٹیج کیے۔ ہوسٹل میں شاندار مشاعرے منعقد کروائے۔ ہم نے دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنایا ہے۔ ہم ایک نئے دور کے پیغامبر ہیں۔ یہ امن اور صلح کی خوش گوار دنیا ہے۔ ایٹم بم کی نئی دنیا (جس میں پاکستان کے خواب دیکھنا انتہائی حماقت ہے)۔ زندہ باد، انوکھ انسانیت۔ پابندہ باد عالمگیر جمہوریت۔

فائی — فو — جنگ ختم ہو گئی — اف کمال — جھے سنبھالو —
 میں بیہوش ہوئی جا رہی ہوں — horror — horror — جنگ ختم ہو گئی —
 اس نے کہا — اور تم فاتح ہو — یہ تمہارے جشنِ فتح کی رات ہے — اور تم انگریز ہو
 اور میں جرمن — تم میرے پاس رقص کے لیے آؤ گے — میں تمہیں پیار کروں گی —
 تم تجھے چونٹا گم دو گے اور پھر میں تمہیں — جانتے ہو — میں تمہیں شوٹ
 کر دوں گی — بڑی آسان بات ہے — میں تمہیں اس ریو اور کے ذریعے
 (جو اصل جرمن ساخت کا ہے اور جسے سیکرٹریٹ نے ہٹلر یوتھ میں شامل ہو کر
 اپنے قبضے سے رخصت ہونے والی صبح شراب خانے کے مالک سے خریدا تھا)
 شوٹ کر دوں گی — پھر تم مر جاؤ گے — ایک کے بعد ایک — اسکوچ کی بوتلیں
 لٹکھاتے ہوئے — کینٹین میں کھلبلی مچ جائے گی — ہٹلری پولیس کی لاریاں

اور ایمبولینس کاریں چاروں طرف دوڑنے لگیں گی۔ تمھارا آفیسر کمانڈنگ اس ہندوستانی آئی۔سی۔ ایس۔ کیو جو اس کیمپ کا انچارج ہے، اور وہ ہندوستانی آئی۔سی۔ ایس۔ اپنی منگیتر اس لڑکی کو یہ دہشت ناک خبر بھولے ہوئے سانس سے منائے گا اور پھر وہ بے ہوش ہو جائے گی۔ سب بیہوش ہو جائیں گے۔ اودھا — کس قدر لذیذ، مسرت بخش خیال ہے۔ پھر اس نے سچے سچ تین گوروں پر ریوہ اللہ سے حملہ کر دیا۔ اُف کمال — کمال!

ایں — جان سے مار ڈالا۔ اور تم واقعی بیہوش ہوئی جا رہی ہو۔ دس قدر دلکش انداز ہے — کاش میں شاعر ہوتا۔ علاوہ انہیں تم اس وقت قطعاً ان بے انتہا ترقی پسند خاتون افسانہ نگار خاتون کی طرح الکیٹ کر رہی ہو جنہیں کچھ دنوں ریڈیو اسٹیشن پر سیاہ رومینٹک برقعے میں ملفوف ایک ڈرامے میں حصہ لیتے ہوئے مائیکروفون پر براڈ کاسٹ کے دوران میں ایک مرد آرٹسٹ کی زبانی خود کو لفظ ”پیار سی“ سے مخاطب ہوتے سن کر فی الفور غش آ گیا تھا۔ یقین کرو تمھاری دوست کی اس سخی نیز حرکت سے میرے قلب کو انتہائی صدمہ پہنچا۔ (لیکن مشیتِ ایزدی میں کیا چارہ ہے؟)

(کتنا لمبا جملہ تھا۔ اس کے ختم ہونے کا انتظار کرتی رہی) — shocking اور پھر جب عارف معائنے کے لیے موقعِ واردات پر پہنچا تو شیطان کا چھوٹا بھائی وہ کبکھت بچہ اسے دیکھتے ہی پٹا پٹا کہتے ہوئے چلا چلا کر دیر تک روتا رہا۔ اُف (رفائی فو)۔

ایں — (رفائی فو!) لالہ — تمھاری دھندلی سی سبز چھلکی ہوئی آنکھیں

آنسو گرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں۔

وہ بچہ — اور — عارف — !

یہ بھی زندگی کے کاروبار کی ایک شاخ ہے (یعنی براہِ نجی آفس)۔ رومان اور
سچیائی — اور — اور یہ تمام خرافات زندگی کے خالص تجارتی پروگرام میں
قطعاً نہیں سما سکتیں۔ (لہذا لالہ رُخ پیاری) اس شاکنگ واقعہ کو بھول کر
گوشت کے پُر سکون پانیوں میں چلو جہاں میں تمھیں وہ جا پاتی نظم سناؤں گا جو شفتو
فوکِ رات میں یا ماسٹھا کے سائے تلے فیوجی کو مارو کے ساز پر گائی جاتی ہے۔
اسمِ تین دوست ہیں۔ میں اور میرا سایہ اور زرد چاند (فانی فو) شپ
— شپ — شپ — شپ —

یہ باتیں

میرے دماغ میں اتنے بہت سے خیالات تیزی سے رقص کر رہے ہیں
 — یہ لے معنی اور بے سرو پایا باتیں — نہ معلوم میرے چھوٹے سے سر میں
 اتنی ساری باتیں کیسے بٹھونس دی گئیں — میرا بیچارہ چھوٹا سا سر —
 بالوں کی سیاہ لٹوں میں لپٹا ہوا — میرے سیاہ بال اور نیلی آنکھیں بہت پسند
 کی جاتی ہیں — ڈینیوب کے نیلے پانیوں کی طرح جھلکتی ہوئی آنکھیں —
 ڈینیوب اور دوانگا — اطالوی اور روسی تاکستانوں کے گرم سائے اور سیب
 کے درختوں کے جھنڈ — رومان — زندگی —

لیکن میری زندگی پر بڑی قنوطیت سی چھائی جانہی ہے۔ شاید موسم بدل
 رہا ہے اس لیے — بے مزہ اور پھلکی پھلکی ہوائیں ہیں کہ چلے جا رہی ہیں —
 پت جھڑ ختم ہونے ہی میں نہیں آتی — یہ دیرالہ سبزہ گاہیں اور سڑکوں پر
 خاموشی سے چکر کاٹتے ہوئے بگولے — یہ صحرائی جھونکے جب اپنے دامن میں
 شاہ بلوط اور شہتوت کے خشک پتوں کو سمیٹے ہوئے میرے درپچے کے سامنے
 سے گزرتے ہیں تو مجھے بڑے زوروں سے غصہ آ جاتا ہے — نہ معلوم بہار کب
 آئے گی !

گزشتہ موسم گل میں تو ہمارا گھر گہرے نیلے اور قرمزی رنگ کے پھولوں کی
 نچان بلیوں میں بالکل چھپ گیا تھا اور باغ میں شہد کی مکھیاں خوب اونچے سروں
 میں بھنجنایا کرتی تھیں اور خالد شنیس کھیلے کھیلے سیٹیاں بجانی شروع کر دیتا تھا۔
 لیکن بھیڑی مجھے اس سے کیا !

رضیہ تجھ سے ایک دن کہہ رہی تھی کہ تم کتابیں دتا میں بہت پڑھتی رہتی ہو
 اسی لیے تمہارا دماغ خراب ہو چلا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہندوستان
 کو رومان کی ضرورت نہیں۔ اسے روٹی چاہیے۔ ٹھیک تو ہے۔ یا !
 بیچارہ کلرکوں اور مزدوروں کا ہندوستان۔ لیکن میں اکیل بھلا کیا کر سکتی ہوں
 اس کے لیے !

پچھلے نومبر کی ایک سرد رات۔ سینا سے واپسی پر خالد نے میرا تعارف
 ایک بہت اچھے سے انسان سے کرایا۔ اور میرا خیال ہے کہ پہلی ملاقات میں ہی میں
 نے اسے بے حد پسند کیا تھا۔ اس کے بعد میں نے اسے چائے پر بلایا۔ لیکن نہ معلوم
 وہ کیوں نہیں آیا۔ تجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بہت رات گئے تک برآمد سے میں
 بیٹھی اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔ کہہ اور دھند کا بڑھتا جازا تھا اور بارش
 شروع ہو گئی تھی۔ سامنے سڑک پر بڑی بڑی موٹریں کچیر کچیر چھنیٹے اڑاتی
 ہوئی نکلی چلی جا رہی تھیں اور انکی پھیل پٹریں روشنیاں تھوڑی دور تک نظر آنے کے بعد
 دھندلے میں غائب ہو جاتی تھیں۔ لیکن وہ آیا ہی نہیں۔ اور مجھے اتنی دیر تک
 ٹھنڈ میں کھڑے رہنے کی وجہ سے زکام بھی ہو گیا۔ اس رات کھانے کی میز پر رضیہ نے
 مجھے بتایا کہ میں بہت زیادہ بیوقوف ہوں۔

چند روز بعد وہ مجھے ایک کافی ماؤس میں ملا۔ میں نے اس سے کہا کہ ٹی پارٹی پر میں نے اس کا بہت انتظار کیا۔ شاید بارش کی وجہ سے راستے میں موٹر خراب ہو گئی اس لیے وہ نہ آ سکا ہوگا۔

”میرے پاس موٹر نہیں ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے جواب دیا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔

”تو آپ نے مجھے فون کر دیا ہوتا، کاہیج دیستی۔“

”میرے پاس فون بھی نہیں ہے۔“

— با بیچارہ آدمی! — کار اور ٹیلی فون کے بغیر کیسے زندگی گزارنا ہوگا۔

میرے دل میں اس کے لیے بے انتہا ہمدردی پیدا ہو گئی۔

اور پھر ہم دونوں میں دوستی ہو گئی۔ اس کے دماغ میں بھی ایسی باتیں ٹھنسی ہوئی تھیں جنہیں انگریزی میں ideas کہتے ہیں۔ اس نے مجھے چند کتابیں پڑھنے کو دیں — ان میں روٹی اور زندگی کے متعلق بہت ساری باتیں لکھی ہوئی تھیں جنہیں میں سمجھ ہی نہ سکی۔ وہ مجھے ”ماہی انطونی“ کہا کرتا تھا۔ اسے مصوری بھی آتی تھی اور میں نے اسے بتایا تھا کہ تجھے لمبے لمبے بالوں والے پائپ پلے ہوئے آرٹسٹ بالکل چنند لگتے ہیں۔

اس کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتی تھیں اور میرا دل چاہتا تھا کہ کشنوں کے سہارے بیٹھ کر انہیں سنتی رہوں یہاں تک کہ اس کے سگریٹ کا دھواں ساری کائنات کو اپنے حلقوں میں جکڑے اور پھر میں صوفے پر بیٹھی اتنے زور سے ٹھوکر لگاؤں کہ یہ احمق اور بے لکھی سی دنیا لڑھکتی ہوئی دور چلی جائے اور پھر

بہت اچھی اچھی سی باتیں ہوں جو نہیں ہو سکتیں اور سب چیزیں ٹھیک ٹھیک ہو جائیں۔

وہ ہمارے یہاں بہت کم آتا تھا۔ نہ معلوم کیوں۔ آخری مرتبہ وہ چچامیاں کے پاس کسی کام سے آیا۔ چچامیاں وائسراؤنگل لاج کی پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔ وہ باہری سے واپس جا رہا تھا لیکن میں نے اسے اندر بلا لیا۔ ہم دونوں کافی دیر تک آتش دان کے پاس بیٹھے رہے۔ جگمگاتا ہوا ڈرائنگ روم — نرم و گرم صوفے اور تالین — تو سے کی پیالیوں میں سے اٹھتی ہوئی بھاپ — اور ریڈیو کی سپانوی موسیقی — مجھے اس وقت اپنا گھر اور زندگی بے حد پیاری اور عزیز معلوم ہو رہی تھی۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش اس کو بھی اتنی ہی راحت اور خوشی محسوس ہو سکے۔ مجھے یقین تھا کہ ساری دنیا میری طرح خوش و خرم ہے۔ اور چند روز بعد سینما مال سے باہر نکلے ہوئے میں نے سنا کہ اس کو شاید نمک کے محکمے میں نوکری مل گئی ہے اور وہ کہیں اور چلا گیا ہے۔ سو یا سو سو روپے کی نوکری — اور میں سوچنے لگی کہ شاید خدا نے دنیا اسی لیے بنائی ہے کہ اس میں سو روپے کی کلر کی کی جائے اور بس۔

لیکن جب میری پیکار ڈسٹرک پر پھیرے ہوئے بارش کے پانی کو زناٹے سے چیرتی ہوئی، جگمگاتی ہوئی تفریح گاہوں کے سامنے سے گزر رہی تھی تو میں نے سوچا کہ جس نظام کے ماتحت ہماری زندگی رواں ہے اسے میں بدل تھوڑا ہی سکتی ہوں۔ جو ہو رہا ہے اور ہوتا آیا ہے وہی ہو گا۔ بھیٹا خالد جو امپیریل سروس میں آگیا ہے تو اس لیے کہ چچامیاں ”ناٹس“ ہیں — اور وہ — وہ — اور وہ —

اور موسم خزاں پھر آگیا۔ رات میں اپنے ڈرائیگ روم کے دریچے سے
 باہر دیکھ رہی تھی۔ سڑک کے ییمپوں کی مدھم روشنیوں میں بھیگی ہوئی چھتوں
 اور گیلے کھیموں کا غیر دلچسپ سا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ جس طرح میری
 زندگی ایک خاموش ہزاری اور یکسانیت سے گزرتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن اچھے سے آدمی! میں اب تک تمہیں بھولی نہیں ہوں۔ شاید
 اگلے موسم بہار تک بھولی جاؤں۔ پر بہار کب آئے گی؟



اودھ کی شام

عجیب — بے حد عجیب — تو تم میرے ساتھ نہیں ناچو گی — نہیں۔
 کیونکہ تم انگریز ہو۔ اور اعلیٰ خاندانوں کی ہندوستانی لڑکیوں کا فوجیوں اور خصوصاً
 امریکن اور انگریز فوجیوں کے ساتھ رقص کرنا بڑی ویسی بات ہے۔ اور جو دیوار
 ساقو جی پچھلے اودھ گھنٹہ سے برابر تمہارے ساتھ لڑھک رہا ہے وہ تو ہندوستانی
 ہے اور میرے چچا کا دوست ہے۔ تم ہندوستانیوں میں آپس میں بڑی محبت ہے —
 اور کیا ہئی — ارے جم تم تو انگریز ہو۔ فرنگی — سفید فام، چھند یا شلجم۔
 ایک تم خوبصورت ہو تو کیا ہوا۔ تمہارے بھائی بندہ تو بچھند رول ایسے ہوتے ہیں سارے
 کے سارے۔ بڑی بے ایمان قوم ہے تمہاری۔ اب تمہیں کان پکڑ کر ہم نکال دیں گے
 — کہ تشریف لے جائیے آپ گھر کو روتے ہوئے۔ کیونکہ بھی ہم کو تو ان اوی ملنے والی
 ہے۔ سمجھے۔ ارے یہ بال روم میں پالیٹیکس کس بد مذاق نے چھیڑ دی۔ ارے جم
 تم اس کی کچھ مٹ سننا۔ یہ بڑی وہ ہے۔ مسلم لیگ بڑی سخت۔ یہ تمہیں بتائے گی
 کہ جناح ایشیا کا سب سے بڑا آدمی ہے۔ جم اگر ہندوستان کو سمجھنا چاہتے ہو تو میں
 تمہیں کتابیں دوں گی پڑھنے کو۔ ٹیگور کی گیتان جلی اور نیتا جی کی سوانح عمری۔
 اس کے علاوہ رامائن اور مہا بھارت بھی کافی مفید ہے۔ اس سے کما اور نروان

اور کمٹی کے سب راز عیاں ہو جائیں گے۔ چودہ طبقی روشن ہو جائیں گے تم پر —
 اور بھٹی جم ہم تو کسی غیر ملکی سے بات بھی کرنا روا نہیں رکھنے۔ اور کیا — لیکن
 تمھاری بات ذرا دوسری ہے۔ اسی لیے تمھیں ہم نے مدعو کیا ہے کیونکہ تم ایک
 لارڈ کے لڑکے ہو اور میرے بھائی کے ساتھ آکسفورڈ میں پڑھ چکے ہو اور اس طرح
 کے نہیں ہو جس طرح کے تمھارے ہم وطن نظر آتے ہیں اور تم بے حد خوبصورت
 اور دلکش ہو۔ تمھاری سبز آنکھوں میں رومان، افسردگی، بے کسی، شرارت،
 سب کی ملی جلی ہر یہی تیرتی رہتی ہیں۔ تجھے تمھاری آنکھیں بہت پسند ہیں لیکن
 اس کے باوجود میں تمھارے ساتھ رقص نہیں کروں گی۔ تمھارا لہجہ بہت عمدہ
 ہے۔ تم پہلے انگریز ہو جو صحیح اور اچھے تلفظ کے ساتھ انگریزی بول سکنے کے علاوہ کسی
 ٹھوس اور سنجیدہ موضوع پر دیر تک آسانی سے گفتگو کر سکتے ہو۔ تم سگریٹ کے دھوئیں
 کے مرغوعے اڑتے ہوئے کورنل داملٹ کے سے انداز میں کہتے ہو کہ ہندوستان کے دو ہفتے
 کے قیام میں تم جن تین چار ہندوستانی لڑکیوں سے ملے انھوں نے تم کو بہت زیادہ امیر پس
 کیا۔ وہ بہت عمدہ ہوتی ہیں۔ ان کے دماغ میں ideas ہیں اور وہ چین کی خانہ
 جنگی اور کمیونزم اور انڈونیشیا کی آزادی پر لمبی لمبی ثقیل بحثیں اسی خوبصورتی کے
 ساتھ کرتی ہیں جس خوبصورتی کے ساتھ وہ مانی پروری اور کھاکلی اور مباحث کرتی ہیں۔
 ان کے انداز میں لوج اور گفتار میں شیرینی ہے۔ ان کے ہنسنے جل ترنگ جیسے ہوتے
 ہیں اور ان کے لباس گویا مرقع پختائی کے نقرئی اوراق کھول دیے گئے ہوں۔
 ہم نے تمھاری ان باتوں کو بہت پسند کیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز ہوتے
 ہوئے بھی تم نے بالی روم میں فلور پر سب سے پہلے میرے رو پہلے غرارے کو

نوٹس کیا تھا۔ تو تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ تم لکھنؤ میں ہو جہاں شام اور دھند ہوتی ہے۔ یہ اودھ دراصل ایک بڑی رومینٹک سی سلطنت تھی۔ تاریخ کے سنہرے صفحات پلٹو تو معلوم ہوگا۔ اور اس کے بادشاہ اوپیرا اور سنگیت سبھاؤں میں راجہ اندر اور جوگی بنا کرتے تھے۔ بڑے نالائق اونکے تھے وہ لوگ۔ جیسی تو یہ جگمگاتی ہوئی پرستان جیسی سرزمین ان سے چھین لی گئی۔ اور یہ جو ریکارڈ اور بے صرف سے تعلقہ داران کے زلفے کی یادگار باقی رہ گئے ہیں ان کی ریاستیں اور زمینیں ہمارے نئی جمہورنی اور نمائندہ حکومت اب بچارے مظلوم کسانوں کو دے دے گی کیونکہ یہ جنتا راج کا بنیادنا ہے۔ آیا خیال شریف میں تمہارے؟ اور تم نے ادا کی مریٹھی اسٹائل کی ساری کی بہت تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اس طرح کی ایک ساری تم اپنی بہن کے لیے دلالت لے جاؤ گے۔ تو وہ بھی کیا یاد کرے گی۔ بچاری۔ اور تمہیں زمینت کے جوڑے میں سجے ہوئے زرد اور بنفشی پھول بے حد آرٹسٹک نظر آتے تھے۔ دراصل بالوں میں پھول سجانے کا ہم لوگوں کو ایک خاص فن آتا ہے کیونکہ ہندوستان پھولوں، خوشبوؤں اور نغموں کا ملک ہے۔ سمجھے؟ ارے کیا ہندوستان ہندوستان پلٹا رہی ہو۔ ابھی گئی تھیں ملک کی واحد قومی جماعت کے خلاف الیکشن میں حصہ لینے۔ لیگ کی ایجنٹ کہیں کی۔ جم میں تم سے کہہ جو رہی ہوں کہ اس سے پولیٹکس کی باتیں نہ کرو۔ یہ تمہیں اپنے پاکستان کا مطلب بھی نہیں سمجھا سکے گی۔ آج تک نہیں سمجھا پائی۔ اور پاکستان ہو جائے گا۔ مس حیدر! تو آپ سے ملنے کے لیے پیپے پاسپورٹ حاصل کرنا پڑے گا۔ یعنی بھی اگر لاہور جانا ہے تو پیپے پاسپورٹ بنواتے پھرو، پھر حصول ادا کرو۔ بڑی طوالت ہوگی۔ بیوقوفی

کی باتیں مت کرو۔ آئندہ۔ کتنے چٹخند ہو۔ یہ تھوڑا ہی ہو گا۔ چارونا چلیں۔ والہ
 کے لیے مال کی روشنیاں مدھم کر دی گئیں۔ پاکستان کے متعلق بعد میں طے کرتے
 رہیں گے۔ عجیب۔ بے حد عجیب۔ کیا بات ہے جم۔ تمھاری آنکھوں
 میں پھر وہی جھلک لہرا اٹھی جیسے چڑیا کا ایک معصوم چھوٹا سا بچہ سخت کرب
 اور بے چینی میں مبتلا ہو اور بے بسی کے مارے تڑپ بھی نہ سکے۔ تم اپنی کرسی
 پیچھے سر کا کر ایک طرف کو کیوں جھک گئے جب کہ والہ کا ایک پیارا سا نعمہ اپنی پوری
 دلاویزی کے ساتھ کچ رہا ہے اور مریں فلور پر رقصاں جوڑے مال کے کناروں
 پر بکھری ہوئی میزوں اور کرسیوں کے قریب سے تیزی کے ساتھ چکر کاٹتے ہوئے
 گزر رہے ہیں۔ غراسے اور ساریاں اور سائے۔ جاؤ تم بھی ناپو اور ناچتے ہوئے
 انسانوں کے اس متحرک اور رنگارنگ جوار بھاٹا میں کھو کر بھول جاؤ کہ تم کہاں ہو
 اور کس سے باتیں کر رہے ہو۔ ہم لوگوں سے ملتے وقت تمھیں سوچنے کی عادت بالکل
 چھوڑ دینی چاہیے۔ جب اپنے ویلنر کی شکار گاہوں کو واپس جاؤ گے اس وقت
 تمھیں کافی فرصت ہو گی کہ ہمارے کیبنے پن، احسان فراموشی اور جنسی اور دوسری
 غلاطیوں کا اپنی عظمت، اپنی اعلیٰ تہذیب اور اپنی چاک کی سفید پہاڑیوں اور
 نیلے سندروں کی خوبصورتی سے موازنہ کر کے ایک کتاب لکھ ڈالو۔ کہاں تک لڑے
 جاؤ گی بھائی! اس سے متعارف ہوئے ابھی تمھیں ایک گھنٹہ بھی نہیں ہوا اور تر لڑتے
 لڑتے اس کا دماغ چاٹ گئیں۔ جھکی آدمی۔ وہ بچارہ اپنے ہم قوموں کی پچھلی
 نالائقیوں پر سخت شرمندہ اور نادام اور پشیمان ہے۔ اور اس کی سبز آنکھوں میں وہی
 رومان، غمیگنی، بے کسی اور شرارت کی ملی جلی ہر میں جھللا رہی ہیں اور اس کے

معصوم اور بہادر برطانوی دل میں صرف یہی ایک خواہش ہے کہ تم اس کے ساتھ ایک آخری دائرہ کر لو کیونکہ کل صبح ہندوستان کو آزادی ملنے والی ہے اور اسے کان سے پکڑ کر تمہارے گھر سے نکال دیا جائے گا۔ اور رات گہری ہوتی جا رہی ہے اور آرکیسٹر کی اسٹیج کے نیچے بھاری زرد پردوں کے سائے میں نیلگوں مرمرین فرش پر کبرے کی دو سفید فام لڑکیوں نے شب کا آخری ناچ شروع کر دیا ہے۔ اور ہال کے بڑے بڑے اور چوڑے دریکچوں کے باہر خوابیدہ فضاؤں میں ”گڈ ٹائٹ ماری“ کے اداس سر لرز رہے ہیں۔ جم کی آنکھیں نیند سے جھجکی جا رہی ہیں۔ جم تم خواب کیوں دیکھتے ہو؟ تمہیں خواب نہیں دیکھنے چاہئیں۔ انگریز ہمیشہ جاگتا رہتا ہے۔ وہ صرف مشین گن چلانا جانتا ہے۔ تم بھی بڑے جھوٹے ہو۔ پوزیٹر ہو بڑے زبردست۔ تم غلط کہتے ہو کہ تمہیں اس پراسرار سرزمین سے عشق ہے جس میں ٹیگور کے گیت ہیں اور اودے شنکر کا ناچ ہے اور ہمالیہ کی برفانی بلندیاں اور نیلوفر سے بھری ہوئی دادیاں ہیں۔ اور۔۔۔ اور جہاں کی سیاہ آنکھوں والی لڑکیاں اپنے بالوں میں نرد اور بنفشی پچھول سجاتی ہیں اور رو پیلے غرارے پہنتی ہیں۔ یہ سب غلط ہے، جھوٹ ہے، دھوکا ہے بہت بڑا۔ یہاں پر صرف گندگی ہے اور غربت اور بے مزگی اور زندگی کا ناگوار، ناقابل برداشت بوجھ۔ زندگی کا کوئی مقصد نہیں، کوئی مصروف نہیں۔ اس یک رنگی، اس بے کیفی، اس نحسگی اور اکتاہٹ کے شدید احساس کو تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم نے فیروز کے نیلگوں ایرکنڈیشنڈ بال روم میں بیٹھ کر ہندوستان سے اظہارِ سہمدی کرنا چاہتے ہو۔ تم گدھے ہو بہت اعلیٰ قسم کے۔ سمجھے؟ اودھ کی شام بہت کالی اور بہت خشک رات میں تبدیل

ہو گئی ہے اور سے فیئر کی گیسٹ ناٹ اختتام پر ہے۔ تمھاری پلکیں خوابوں کے
 بوجھ سے جھکی جا رہی ہیں۔ زینت کے بالوں کے زرد پھول مرجھا کر فرش پر گر چکے
 ہیں جنھیں روندتے ہوئے ہم ابھی نیچے چلے جائیں گے، ہم سب کے سب اور یہ
 جگمگاتا ہوا رقص کا ایوان خالی ہو جائے گا اور اس کی تیز رفتاری روشنیاں ایک ایک
 کر کے بجھا دی جائیں گی اور آج کی رات کے بعد ہم سب تمھیں جھول جائیں گے۔ یہ
 سیاہ فام مدراسی کارڈونٹ، جو ایک کونے میں خاموشی سے اپنی کرسی پر
 بیٹھ بیٹھ اپنی اسکیچ بک میں تمھارے بے شمار پرو فائل بنا چکا ہے، اور یہ
 خوبصورت اور ڈیٹنگ اور مغرور سہارے ماں کے روزانہ انگریزی اخبار کا ایڈیٹر
 اور آئنڈریڈ لیکایہ پروگرام ڈائریکٹر، جو انگریزی میں شاعری کرتے کرتے سب
 کو بور کر دیتا ہے۔ اور ادا جو ایڈی لیما کی طرح حسین ہے اور تمھیں پورن برہما
 کا فلسفہ سمجھانے کی کوشش میں اپنی ساری شام ضائع کر چکی ہے۔ وہ کہہ رہی
 ہے کہ وہ اگلی اتوار کے پائیر کے میگزین سیکشن میں تمھارے متعلق ایک کہانی لکھے گی۔
 اور زینت، جو سپرانو ہے، اور میرے بھائی کی منیجر، وہ تمھاری یاد میں
 ایک گیت کمپوز کرنے والی ہے۔ اور میں نے بھی تم سے وعدہ کیا ہے کہ میں
 تمھاری ایک تصویر بناؤں گی اور اس میں تمھاری آنکھوں کے لیے آسمان کی
 نیلا ہٹ اور کشمیر کی گل پوش جھیلیوں کی سبزی اور چاند کی جھلکی جھلکی کر نوں کی
 جھلملاہٹ کے رنگ استعمال کروں گی۔ اور آئنڈ اپنی انگریزی نظموں کا جو مجموعہ
 لندن سے شائع کروا رہا ہے اس میں تمھارے اوپر بھی چند شعر شامل کرنے گا۔ لیکن
 واقعہ یہ ہے کہ کل صبح کے بعد جب کہ تم ہندوستان سے جا چکے ہو گے ہم اس آسانی

اور اطمینان کے ساتھ فراموش کر دیے جاؤ گے جس آسانی اور اطمینان سے زندگی
 کی اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں اور واقعات بھلا دیے جاتے ہیں۔ دراصل
 یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ تم نے ہماری تصویروں کی تعریف کی، ہمارے
 رقص دیکھے، ہماری موسیقی کو پرکھا لیکن یقین جانو کہ ہماری تصویریں،
 ہمارے افسانے اور ہمارے ناچ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ جب زندگی کا کوئی مقصد
 نہیں ہے تو ان چیزوں کا کیا ہو سکتا ہے؟ کوئی end ہی نہیں تو means کی
 بہتری یا افادیت میں سرکھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے میٹر آف فیکسٹ
 برطانوی دماغ کے لیے ذرا انوکھی باتیں ہیں نا؟ ہم سب تمہارے لیے بہت انوکھے
 ہیں، اوما اور زینت اور میں — سارے کے سارے۔ ہمارا فلسفہ بھی انوکھا
 ہے جسے ہم confusionism کا فلسفہ کہتے ہیں۔ جو بہترین ہے اور انتہائی
 مفید ہے۔ زندگی جس طرح بھی سامنے آئے اسے اپنالو۔ نرالا فلسفہ ہے نا۔ ہر
 نرالی چیز ہی تو دلچسپ ہوتی ہے ورنہ تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ یہ انسانیت
 کی لڑائی ہے حد انوکھی تھی جس کی وجہ سے تم ویلش قلعے اور اپنی پہاڑی شکار گاہوں
 اور اپنے لارڈ باپ کو کشنوں پر سرٹیکے لیبر گورنمنٹ کے بجٹ پر نکتہ چینی کرنے کے لیے
 چھوڑ کر اس وقت یہاں سے فیڈر بال روم میں بیٹھے ویدانت کے فلسفے اور پاکستان
 کے حجاز سے اُجھنے کی کوشش میں مصروف ہو۔ یہ زندگی اور یہ شاہیں بالکل نرالی
 ہیں جن میں آنے والے قحط اور مٹر ہو ور کے اپنے اپنے اندیشے ظاہر کرنے کے بعد
 اپنی میزوں پر سے اٹھا اٹھ کر رقص میں گھومنے گھومتے متواتر پانچ چھ گھنٹے گزر
 جاتے ہیں اور ہم بالکل نہیں تھکتے۔ اوما انتہائی انوکھی لڑکی ہے کہ اعتقاداً سخت

ہندو ہونے کے باوجود ایک مسلمان سے شادی کر کے غرارہ میں کرسلام علیکم کہتی ہے اور میں شاید اس سے بھی زیادہ انوکھی ہوں کہ مسلمان ہوتے ہوئے بھی جے ہند اور نمسکار کر لیتی ہوں جب کہ تمہیں بتایا گیا ہے کہ ہم لوگ بازاروں میں ایک دوسرے کے گلے کاٹ ڈالتے ہیں۔ ”گوڈ سیودی کنگ“ بجنا شروع ہو گیا ہے۔ جم فوراً کھڑے ہو جاؤ۔ تم میرے ساتھ ان باتوں میں اس قدر محو ہو گے کہ تمہیں اس بات کا بھی خیال نہیں رہا۔ ہم لوگ نیچے جا رہے ہیں۔ اپنے نیشنل اینٹھم کے بعد نیچے آ کر پورٹیکو میں ہم سے رخصت ہو لینا کیونکہ رات بھگی جا رہی ہے اور سفیدے کے درختوں کے نیچے سے ابھی چاند طلوع نہیں ہوا ہے اور تمہیں معلوم ہونا چاہیے جم کہ اندھیری راتوں میں ہم پورٹیکو کو خواہ مخواہ ڈرنگا کرتا ہے۔ رات خاموش ہے اور ہماری کار تیزی سے مے فیئر کے پورٹیکو کی نیلگوں اور خنک دھندلی روشنیوں کو پیچھے چھوڑتی آ رہی ہے۔ دو لاما مارٹینز کلج کی پٹر شکوہ فرانسیسی عمارتوں کا سیاہ عکس ان کی سیڑھیوں کے نیچے سوتی ہوئی بھیل پر لرز رہا ہے۔ چپ چاپ اور بے حس! اور سکندر باغ، دلکش اور بنارس باغ کے وسیع بہنر ٹھمیں میدان، اور سفیدے کے جنگل، مدھم چاندنی کے سنڈے میں سائیں سائیں کر رہے ہیں۔ اور گومتی کے شاندار پل کے کنارے دریا پر جھکی ہوئی سرخ پتھر کی ایک شہ نشین پر آسمان کے مقابلے میں سلہٹ سا نظر آ رہا ہے اور اس کے سامنے چھتر منزل خاموشی اور غرور سے آدھی رات کے آسمان کی طرف اپنی طلائی چھتری بلند کیے اپنی رقص گاہ کی روشنیاں اپنے قدموں میں بہتی ہوئی گومتی کی سطح پر پھینک رہی ہے۔ یہ اودھ کی رات ہے اور جم تم چند گھنٹوں بعد ان راتوں سے ہمیشہ کے لیے

دور ہو جاؤ گے اور تمھارا ڈیکوٹا طیارہ گومتی اور سر جو اد رنگنگا کی مدد پہلی لکیروں کے اوپر سے گزرتا، انھیں نیچے چھوڑتا ہوا دور مغربی سمندروں کے اونچے بادلوں میں کھو جائے گا۔ ادھی رات کا پرند بچھڑا اٹھا ہے۔ چاروں طرف دور دور تک بھیلی ہوئی خوابیدہ کائنات پر پرستان کا سحر چھا رہا ہے۔ دریچے کے باہر، شریفیہ کے درختوں کی دوسری جانب ہسٹک کے کنارے وہ پرانا پھاٹک خاموشی سے استادہ ہے اور اس کی اوپر کی منزلوں اور شہ نشینوں میں مدہم روشنیاں جھلملا رہی ہیں۔ دور چوکیاں باغ کی رکھوالی کرتے کرتے چلا اٹھتا ہے۔ ہنہ ہنہ — لالالا — اور اس کے برہا کی ہوا نے بازگشت دیر تک گومتی کی روپہلی ریتوں پر گونجتی رہتی ہے اور ایریل کے بانس پر بیٹھم موئے چندول کی تیز آوازاں کے سناتے کو کاشتی ہوئی اندھیرے کی وسعتوں میں پھلتی جا رہی ہے۔ چندول ذات کے لحاظ سے اٹو کے چھوٹے بھائی کی ایک قسم ہے۔ جسم بھی اٹو کا چھوٹا بھائی ہے۔ اور مجھے یاد ہے کہ اس نے سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہو کر خدا حافظ کہتے وقت کار کا دروازہ بند کرنے سے پہلے جھک کر میرے غرازے کے پانچے سمیٹ کر اندر اٹھا بنے میں میری مدد کرتے ہوئے، جو فٹ بورڈ پر گرے جا رہے تھے، اگلی سیٹ پر سبز چمن کو سگریٹ کا دھواں اڑتے دیکھ کر مجھ سے چپکے سے کہا تھا کہ اسے عورتوں کا سگریٹ پینا بالکل پسند نہیں اور وہ اپنی مہنوں کو بھی سگریٹ نہیں پٹینے دیتا کیونکہ وہ امریکن نہیں انگریز ہے اور انگریز بہت قدامت پرست ہوتے ہیں اور رات کے دو بجنے والے ہیں اور فرش پر برقی چولہے کے قریب کائی کی سیالیاں بے ترتیبی اور اکتاہٹ کے انداز میں منتشر ہیں۔ ابھی بہت پڑھنا ہے کیونکہ امتحان

میں ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ کیا کریں گے اتنا پڑھ کر جانے۔ پرانے زمانے کے بادشاہوں کا وہ پھاٹک اندھیرے میں زیادہ بلند، زیادہ بہیبت ناک اور زیادہ خوبصورت نظر آ رہا ہے جس کی خوبصورتی اور عظمت سے دل میں ایک ناقابل بیان خوف سا محسوس ہوتا ہے اور جس کی عظیم الشان حوالموں کے نیچے سے دن بھر یو۔ ٹی۔ سی۔ کے جیب اور لائبریری کو جانے یا وہاں سے واپس آنے والی لڑکیوں کے گروہ گزرتے رہتے ہیں۔ اور میں پڑھنے کے بجائے تصویریں بنا رہی ہوں۔ اور زینت کہتی ہے کہ تم تصویریں کیوں بناتی ہو۔ مت بنایا کرو تصویریں بلکہ کوئی اور زیادہ مفید کام شروع کر دو۔ مثلاً باورچی خانے کے باغ میں گو بھی کی کیا ریاں تیار کرو تا کہ زیادہ غذا پیدا کی جاسکے اور گورنمنٹ ہاؤس کی ٹی پارٹی میں گورنر صاحب کی میم صاحب ہم لوگوں کی زیادہ تعریف کیا کریں۔ اور زینت انوکھس کی موٹی موٹی کتابوں کو قالین پر پھینک کر اپنی پیانو کی کاپی کے ورق اٹھاتے ہوئے سلام کا کوئی بیکار اور لغو سا شعر گنگنا رہی ہے : میں اگر زند ہوں پھر شام اودھ آئے گی یا جلنے کیا۔
واقعہ یہ ہے کہ ہم سب ٹھنڈ ہیں۔

مونالسا

(ایک طویل رومان)

پریوں کی سرزمین کو ایک راستہ جاتا ہے شاہ بلوط اور صنوبر کے جنگلوں میں سے گزرتا ہوا جہاں روپہلی ندیوں کے کنارے چیری اور بادام کے سایوں میں خوبصورت چرواہے چھوٹی چھوٹی بانسریوں پر خوابوں کے نغمے لاپتے ہیں۔ یہ نہرے چاند کی فادی ہے - Never Never Land کے منور اور خوبصورت شہزادے پیرٹین کا ملک جہاں ہمیشہ ساری باتیں اچھی اچھی ہوا کرتی ہیں۔ آئس کریم کی برف پڑتی ہے۔ چو کلیٹ اور پلم کیک ہکے مکانوں میں رہا جاتا ہے۔ موٹر میں پیٹرول کی بجائے چائے سے چلتی ہیں۔ بغیر مڑھے ڈگریاں مل جاتی ہیں۔ اور کہانیوں کے اس ملک کو جانے والے راستے کے کنارے بہت سے

سائن پوسٹ کھڑے ہیں جن پر لکھا ہے ”صرف موٹروں کے لیے“، ”یہ عام راستہ نہیں۔“ اور شام کے اندھیرے میں لٹائے سے آتی ہوئی کاروں کی تیز روشنی میں نرگس کے پھولوں کی چھوٹی سی پہاڑی میں سے جھلکتے ہوئے یہ الفاظ جگمگا اٹھتے

میں : ”پلیز آہستہ چلائیے — شکریہ !“

اور بہار کی شگفتہ اور روشن دوپہروں میں سنہرے بالوں والی کرلی لوکس، سنڈریلا اور اسنو وائٹ چھوٹی چھوٹی پھولوں کی ٹوکریاں لے کر اس راستے پر چیری کے سفید شگوفے اور ستارہ سُحری کی کلیاں جمع کرنے آیا کرتی تھیں۔

ایک روز کیا ہوا کہ ایک انتہائی ڈیٹنگ شہ سوار راستہ بھول کر ہنوبروں کی اس وادی میں آنکلا جو دور دراز کی سرزمینوں سے بڑے بڑے عظیم الشان معرکے سر کر کے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اپنے شاندار گھوڑے پر سے جھک کر کہا: ”مائی ڈیرینگ لیڈی کیسی خوش گوار صبح ہے!“

کرلی لوکس نے بے تعلق سے جواب دیا : ”اچھا، واقعی؟ تو پھر کیا ہوا؟“
 شہ سوار کی خواب ناک آنکھوں نے خاموشی سے کہا : ”پسند کر رہی ہیں۔“
 کرلی لوکس کی بڑھی بڑھی روشن اور نیلی آنکھوں میں بے نیازی جھللا اٹھی۔
 ”جنابِ عالی ہم بالکل نوٹس نہیں لیتے۔“ شہ سوار نے اپنی خصوصیات بتائیں۔
 ایک شاندار سی امپیریل سروس کے مقابلے میں top کیا ہے۔ اب تک ایک سو پینتیس ڈومیل لڑ چکا ہوں۔ بہترین قسم کا heart breaker ہوں۔

کرلی لوکس نے غصے سے اپنی سنہری لٹیں جھٹک دیں اور اپنے بادامی ناخنوں کے برگنڈی کیوٹیکس کو غور سے دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ سنڈریلا اور اسنو وائٹ پگنڈی کے کنارے اسٹرابری چنتی رہیں۔

اور ڈیٹنگ شہ سوار نے بڑے ڈیمینک انداز سے جھک کر نرسری کا ایک پرانا گیت یاد دلایا :

کر لی لوکس کر لی لوکس

یعنی اسے میری پیار سی چینی کی گڑیا۔

تمھیں برتن صاف کرنے نہیں پڑیں گے۔

اور بطنوں کو لے کر چراگاہ میں جانا نہیں ہوگا۔

بلکہ تم کشنوں پر بیٹھی بیٹھی اسٹرابری کھایا کرو گی۔

اسے میری سنہرے گھنگرے بالوں والی مغرور شہزادی ایمیلیا سنہری ایٹارایا۔

دو نینا متوار سے تمھارے ہم پر ظلم کریں۔

اور پھر وہ ڈیشنگ شہ سوار اپنے شاندار گھوڑے کو ایڑ لگا کر دوسری سڑ مینوں

کی طرف نکل گیا جہاں اور بھی زیادہ عظیم الشان اور زبردست موٹر کے اس کے منتظر

تھے۔ اور اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز باز گشت پہاڑی راستوں اور وادیوں

میں گونجتی رہی۔

پھر ایک اور بات ہوئی جس کی وجہ سے چاند کی وادی کے باسی غمگین رہنے

لگے کیونکہ ایک خوش گوار صبح معصوم کوک رو بن ستارہ سحر کے سبزے پر مقتول

پایا گیا۔ مرحوم پر کسی ظالم نے تیر چلا یا تھا۔ سنڈریلا رونے لگی۔ بچا رامیر مصرخ

اور نیلے پروں والا گڈو سا پرندہ۔ پرستان کی ساری چڑیوں، خرگوشوں اور

گھبراہٹوں نے مکمل تحقیق و تفتیش کے بعد پتا چلا لیا اور بلا اتفاق پر اسے اس کی

بے وقت اور جوان موت پر تعزیت کی قرارداد منظور کی گئی۔ یونیورسٹی میں کوک

روبن ڈے منایا گیا لیکن عقل مند پوسی کیٹ نے، جو فلی بوٹ سپن کو ملک سے ملنے

لندن جایا کرتی تھی، سنڈریلا سے کہا: ”رو موت میری گڑیا، یہ کوک

روبن تو یونہی مرا کرتا ہے اور پھر فرسٹ ایڈ ملتا ہی فوراً زندہ ہو جاتا ہے۔ اور کوک روبن سچ مچ زندہ ہو گیا۔ اور پھر سب ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اور ہمیشہ کی طرح وادی کے سبزے پر بکھرے ہوئے گلے کی ننھی ننھی لکھیاں اور دور دور سمندر کے کنارے شفق میں کھوئے ہوئے پیرائے عبادت خانوں کے گھنٹے اہستہ اہستہ بجتے رہے۔ ڈنگ ڈونگ، ڈنگ ڈونگ بل، پوسی ان دویل۔

ڈنگ ڈونگ۔ ڈنگ ڈونگ۔ جیسے کرنی لوکس کہہ رہی ہو: نہیں، نہیں، نہیں، نہیں، نہیں!

اور اس نے کہا۔ نہیں نہیں۔ یہ تو پریوں کے ملک کی باتیں تھیں۔ میں کوک روبن نہیں ہوں، نہ آپ کرنی لوکس یا سنڈریلا ہیں۔ ناموں کی ٹوکری میں سے جو پرچی میرے ہاتھ پڑی ہے اس پر ریٹ بٹنر لکھا ہے لہذا آپ کو اس کارٹ او بار ہونا چاہیے۔ ورنہ اگر آپ جولیٹ یا کلیو پٹرا ہیں تو رو میو یا انطونی صاحب کو تلاش فرمائیے۔ اور میں قاعدے سے مس او بار کی فکر کروں گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آپ جولیٹ یا میٹرس یا ماری انطونی نہیں ہیں۔ اور میں قطعی ریٹ بٹنر نہیں ہو سکتا۔ کاش آپ محض آپ ہوتیں اور میں صرف میں۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ لہذا آئیے اپنی اپنی تلاش شروع کریں۔

— ہم سب کے راستے یونہی ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے پھر الگ الگ چلے جاتے ہیں لیکن پرستان کی طرف تو ان میں سے کوئی راستہ بھی نہیں جاتا۔

— چو کو بارز کی اسٹانوں اور لکی ڈپ کے خیمے کے رنگین دھاری دار

پردوں کے پیچھے چاندنی کی ننھی مٹی گھنٹیاں بجتی رہیں۔ ڈنگ ڈنگ ڈنگ ڈنگ
 — پوسی بچاری کھوٹیں میں گر گئی۔ اور ٹوم اسٹاؤٹ بے فکری سے ہج کو بار نہ
 کھاتا رہا۔ پھر وہ سب دندگی کی ٹریجڈی میں غور کرنے میں مصروف ہو گئے کیونکہ وہ
 چاند کی وادی کے باسی نہیں تھے۔ لیکن اتنے احمق تھے کہ پرستان کی پلگڈنڈی پر موسم
 گلی کے پہلے سفید شگوفے تلاش کرنے کی کوشش کر لیا کرتے تھے اور اس کوشش میں
 انھیں ہمیشہ کسی نہ کسی اجنبی ساحل، کسی نہ کسی آن دیکھی، آن جانی چٹان پر فورسٹ
 لینڈنگ کرنی پڑتی تھی۔ وہ کئی تھے۔ ڈک ڈنگلٹن جسے امید تھی کہ کبھی نہ کبھی تو اسے
 فل بوٹ پہننے والی وہ پوسی کیٹ مل ہی جائے گی جو اسے خوابوں کے شہر کی طرف
 اپنے ساتھ لے جائے۔ اور اسے یقین تھا کہ خوابوں کے شہر میں ایک فیملی آنکھوں
 والی ایلیس اپنے ڈرائنگ روم کے آتش دان کے سامنے بیٹھی اس کی راہ دیکھ
 رہی ہے۔ اور وہ افسانہ نگار جو سوچتا تھا کہ کسی روپے راج ہنس کے پروں پر
 بیٹھ کر اگر وہ دندگی کے اس پار کہانیوں کی سرزمین میں پہنچ جائے جہاں چاند کے
 قلعے میں خیالوں کی شہزادی رہتی ہے تو وہ اس سے کہے: ”میری مغرور شہزادی!
 میں نے تمہارے لیے اتنی کہانیاں، اتنے ادبیر اور اتنی نظمیں لکھی ہیں۔ میرے
 ساتھ دنیا کو چلو تو دنیا کتنی خوبصورت، زندہ رہنے اور محبت کرنے کے قابل جگہ بن
 جائے۔“ لیکن روپے راج ہنس اسے کہیں نہ ملتا تھا۔ اور وہ اپنے بارع میں
 بیٹھا بیٹھا کہانیاں اور نظمیں لکھا کرتا تھا۔ اور جو خوبصورت اور عقل مند لڑکی اس
 سے ملتی اسے ایک لمحے کے لیے یقین ہو جاتا کہ خیالوں کی شہزادی چاند کے ایوانوں
 میں سے نکل آئی ہے۔ لیکن دوسرے لمحے وہ عقل مند لڑکی ہنس کو کہتی کہ افوہ،

بھئی فن کار صاحب! کیا cynicism بھی اس قدر انفلیشن ایبل چیز بن گئی ہے۔ اور آپ کو یہ مغالطہ کب سے ہو گیا ہے کہ آپ جینیس بھی ہیں۔ اور اس کے فکری قہقہے کے ساتھ چاند کی کرنوں کی وہ ساری سپر ہیاں ٹوٹ کر گر پڑیں جن کے ذریعے وہ اپنی نظموں میں خیالستان کے محلوں تک پہنچنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ اور دنیاویسی کی ویسی ہی ہستی — اندھیری، ٹھنڈی اور بد صورت — اور سنڈریلا جو ہمیشہ اپنا ایک بلورین سینڈل رات کے اختتام پر خوابوں کی جھلملاتی رقص گاہ میں بھول آتی تھی، اور وہ ڈیننگ مشہ سوار جو پرستان کی خاموش، شفق کے رنگوں میں کھوئی ہوئی پگڈنڈیوں پر اکیلے اکیلے ہی ٹھلا کرتا تھا۔ اور برف جیسے رنگ اور سرخ انگارہ جیسے ہونٹوں والی اسنو واٹ جو رقص کرتی تھی تو بوڑھے شاہ کول کے دربار کے تینوں پری زاد مغنی اپنے دامن بجانا بھول جاتے تھے۔

”اور“، ریٹ بکر نے اس سے کہا، ”میں اوما آپ کو کون سا رقص زیادہ پسند ہے۔ ٹینگو — فوکس ٹروٹ — رومبا — ایسے ہیبتناک کریں۔“

اور افروز اپنے پارٹنر کے ساتھ رقص میں مصروف ہو گئی حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اسکارٹ اور ہارا نہیں ہے کیونکہ وہ چاند کی دنیا کی باسی نہیں تھی۔ سبزے پر رقص ہو رہا تھا۔ روش کی دوسری طرف، ایک درخت کے نیچے، مکڑی کے عارضی پلیٹ فارم پر چارلس جوڈا کا آرکیسٹرا اپنی پوری سونگ میں تیزی سے بچ رہا تھا۔ اور پھر ایک دم سے قطعے کے دوسرے کنارے

پراساتادہ لاؤڈ اسپیکر میں کارن میرانڈا کا ریکارڈ چیلنے لگا: ”تم آج کی رات کسی کے بازوؤں میں ہونا چاہتی ہو؟“ لکی ڈپ اور ”عارضی کافی ٹاؤس“ کے رنگین خیموں پر بندھی ہوئی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ بجتی رہیں۔ اور کسی نے اس کے دل میں آہستہ آہستہ کہا: موسیقی۔
— دیوانگی — زندگی — دیوانگی — شویاں کے نغمے — ”جیسی مول“۔

او خدا!! اس نے اپنے ہم رقص کے مضبوط، پُر اعتماد، مغرور بازوؤں پر اپنا بوجھ ڈال کر ناچ کے ایک کوئیک اسٹیپ کا ٹرن لیتے ہوئے اس کے شانوں پر دیکھا۔ سبزے پر اس جیسے کتنے انسان اس کی طرح دودو کے رقص کی ٹکڑیوں میں منتشر تھے۔ ”جولیت“ اور ”رومیو“، ”کٹوریہ“ اور ”البرٹ“، ”بیٹرس“ اور ”دانٹے“ ایک دوسرے کو خوبصورت دھوکے دینے کی کوشش کرتے ہوئے، ایک دوسرے کو غلط سمجھتے ہوئے اپنی اس مصنوعی، عارضی، چاند کی دادی میں کتنے خوش تھے وہ سب کے سب! بہار کے پیلے شگرفوں کے متلاشی اور کاغذی کلیوں پر قانع اور مطمئن۔ زندگی کے تعاقب میں پریشان و سرگرداں زندگی۔ ہنہ۔ شویاں کی موسیقی، سفید گلاب کے پھول، اور اچھی کتابیں۔ کاش! زندگی میں صرف یہی ہوتا، چاند کی دادی کے اس افسانہ نگار اویناش نے ایک مرتبہ اس سے کہا تھا۔ ہنہ۔ کتنا بھٹکتا ہو اویناش! ابھی سامنے سے ایک خوبصورت لڑکی گزر جائے اور تم اپنی ساری تخیل پرستیوں بھول کر سوچنے لگو گے کہ اس کے بغیر تمہاری زندگی میں کتنی بڑی کمی ہے۔ اور اویناش نے کہا تھا کاش جو ہم سوچتے ہو ہی ہوا کرتا، جو ہم

چاہتے وہی ملتا — ہائے یہ زندگی کا لگی ٹرپ — ! زندگی، جس کا جواب
 مونا لسا کا تبسم ہے۔ جس میں نرسری کے خوبصورت گیت اور چاند ستارے
 تراشی ہوئی کہانیاں تمھارا مذاق اڑاتی، تمھارا منہ چڑھاتی بہت سیچھے رہ جاتی
 ہیں جہاں کوک رو بن پھر سے زندہ ہونے کے لیے روز نئے نئے تیروں سے
 متا بہتا ہے — اور کرلی کوکس ریشمیں کشنوں کے انبار پر کبھی نہیں چڑھ پاتی
 — کاش افروز تم — اور پھر وہ خاموش ہو گیا تھا کیونکہ اسے یاد آ گیا
 تھا کہ افروز کو کاشن — اس سستے اور جذباتی لفظ سے سخت چڑھے۔
 اس لفظ سے ظاہر ہوتا ہے جیسے تمھیں خود پر اعتماد، بھروسہ، یقین نہیں۔
 اور افروز لیجھ داک کی اچھل کود سے تھک گئی۔ کیسا بیہودہ ساناچ
 ہے۔ کس قدر بے معنی اور فضول سے steps ہیں۔ بس اچھلتے اور گھومتے
 پھر رہے ہیں، بیوقوفوں کی طرح۔

”مس ادھارا —!“ اس کے ہم رقص نے کچھ کہنا شروع کیا۔
 ”— افروز سلطانہ کہیے۔“

”اوہ — مس افروز حمید علی — آئیے کہیں بیٹھ جائیں۔“

”بیٹھ کر کیا کریں؟“

”ار — باتیں!“

”باتیں آپ کر ہی کیا سکتے ہیں سوائے اس کے کہ مس حمید علی آپ یہ ہیں،
 آپ وہ ہیں، آپ بے حد عمدہ رقص کرتی ہیں، آپ نے کل کے سنگلز میں
 پرکاش کو خوب ہرایا —“

”ارے غالباً آپ کو سیاسیات سے —“

”شکریہ اویناش اس کے لیے ضرورت سے زیادہ ہے۔“

”اچھا تو پھر موسیقی یا پال مٹنی کا نیا فلم —“

”مختصر یہ کہ آپ خاموش کسی طرح نہیں بیٹھ سکتے —“ وہ چپ ہو گیا۔

پھر شام کا اندھیرا اچھانے لگا۔ درختوں میں رنگ برنگ برقی قمقے جھللا اٹھے۔ اور وہ سب سبزے کو خاموش اور سناں چھوڑ کے بال روم کے اندر چلے گئے۔ آرکیٹر کی گت تبدیل ہو گئی۔ جاز اپنی پوری تیزی سے بجنے لگا۔ وہ ہال کے سرے پر شیشے کے لمبے لمبے دریچوں کے پاس بیٹھ گئی۔ اس کے قریب اس کی جمانی کا چھوٹا بھائی، جو کچھ عرصے قبل امریکہ سے واپس آیا تھا، میری ووڈ سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اور بہت سی لڑکیاں اپنی سبز بید کی کرسیاں اس کے آس پاس کھینچ کر انتہائی انہماک اور دل چسپی سے باتیں سن رہی تھیں۔ اور میری ووڈ ہنسے جا رہی تھی۔ میری ووڈ، جو سانولی رنگت کی بڑی بڑی آنکھوں والی ایک اعلیٰ خاندان عیسائی لڑکی اور انگریز کنزل کی بیوی تھی، ایک ہندوستانی فلم میں کلاسیکل رقص کر چکی تھی اور اب جاز کی موسیقی اور شیریں کے گلاسوں کے سہارے اپنی شامیں گزار رہی تھی۔

اور پائپوں اور سگریٹوں کے دھوئیں کا ملا جلا لرزتا ہوا عکس بال روم کی سبز روغنی دیواروں پر بنے ہوئے طیاروں، پام کے درختوں اور رقصاں اسپر اوں کے دھندلے دھندلے نقوش کو اپنی لہروں میں لپیٹتا، ناچتا، رنگین اور روشن چھت کی بلندی کی طرف اٹھتا رہا۔ خوابوں کا شبنم آلود

سحر آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔

اور یک نخت، میری دوڑنے زور سے ہفتا اور چلا نا شروع کر دیا۔
افروز کی حمائی کے ہالی ووڈ پلٹ بھائی نے ذرا گھبرا کر اپنی کرسی پیچھے کو سرکا
لی۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ آرکیسٹر کے سر آہستہ آہستہ ڈوبتے گئے
اور دبی دبی ہنسی اور مدھم قہقہوں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ وہ سبز آنکھوں
والی زرد روٹولڈ کی، جو بہت دیر سے ایک ہندوستانی پرنس کے ساتھ ناچ رہی
تھی، تھک کر افروز کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اس کا باپ، جو ایک ہندوستانی
ریاست کی فوج کا افسر اعلیٰ تھا، فرن کے پتوں کے پیچھے گہری میں بیٹھا اطمینان
سے سگار کا دھواں اٹاتا رہا۔

پھر کھیل شروع ہوئے۔ اور ایک بے حداوث پٹانگ سے کھیل میں حصہ
لینے کے لیے سب دوبارہ ہال کی فلور پر آ گئے اور افروز کا ہم رقص ریٹ بشلر
اپنے خواب ناک آنکھوں والے دوست کے ساتھ اس کے قریب آیا: ”مس
حمید علی آپ میری پارٹنر ہیں نا؟“
”جی ہاں۔ آئیے۔“

اور اس خواب ناک آنکھوں والے دوست نے کہا: ”بارہ بجنے والے ہیں۔
نیا سال مبارک ہو۔ لیکن آج اتنی خاموش کیوں ہیں آپ؟“
”آپ کو بھی مبارک ہو۔ لیکن ضرورت ہے کہ اس زبردست خوشی میں
خواہ مخواہ کی بیکار باتوں کا سلسلہ رات بھر ختم ہی نہ کیا جائے۔“
”لیکن میں تو چاہتا ہوں کہ آپ اس طرح خاموش نہ رہیں۔ اس سے

خواہ مخواہ یہ ظاہر ہو گا کہ آپ کو اس مجھے میں ایک مخصوص شخص کی موجودگی ناگوار گزر رہی ہے۔“

”پر جو آپ چاہیں لازم تو نہیں کہ دوسروں کی بھی وہی مرضی ہو۔ کیونکہ جب آپ کچھ کہتے ہوتے ہیں اُس وقت آپ کو یقین ہوتا ہے کہ ساری دُنیا بے حد دل چسپی سے آپ کی طرف متوجہ ہے۔ اور بعد میں لڑکیاں کہتی ہیں: افوہ! کس قدر مزے کی باتیں کرتے ہیں انور صاحب اور کتنے اسکاٹ مذاق ہوتے ہیں آپ۔“

اتنے میں پرکاش کاغذ اور پنسلیں تقسیم کرتی ہوئی ان کی طرف آئی اور ان کو ان کے فرضی نام بتاتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر کے لیے سب چپ ہو گئے۔ پھر تہقنوں کے شور کے ساتھ کھیل شروع ہوا۔ کھیل کے دوران میں اس نے اپنی خواہناک آنکھیں اٹھا کر یہ بھی کچھ نہ کچھ بولنے کی غرض سے پوچھا: ”جی، تو ہم کیا باتیں کر رہے تھے؟“

”میرا خیال ہے کہ ہم باتیں قطعی کر ہی نہیں رہے تھے۔ کیوں نہ آپ قاعدے سے اپنی پارٹنر کے ساتھ جا کر کھیلے۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں اسکاٹ اور اراہوں۔ جو لیت ابھی آپ کو تلاش کر رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر نہرہ اور اویناش اس کی طرف آگئے اور وہ ان کے ساتھ کھیل میں مصروف ہو گئے۔“

اور جب رات کے اختتام پر وہ رفعت کے ساتھ اپنا اوور کوٹ لینے کے لیے کلوک روم کی طرف جا رہی تھی تو گیلمی کے سامنے کی طرف سے گزرتے ہوئے اس نے اس سبز آنکھوں والی زرد زو جولیٹ کے باپ کو اپنے دوستوں سے

کہتے سنا: ”آپ میرے داماد میجر بھنڈاری سے ملے؟ مجھے تو خبر ہے کہ میری بڑی لڑکی نے اپنے فرقے سے باہر شادی کرنے میں ذات اور مذہب کی دنیاوی قیود کی پروا نہیں کی۔ اب وہ بہت جلد چیف آف دی اسٹاف ہونے والا ہے۔ میری لڑکی کا انتخاب پسند آیا آپ کو؟“ ہاں ہاں ہاں۔ دراصل میں نے اپنی چاروں لڑکیوں کا ٹیسٹ کچھ اس طرح cultivate کیا ہے کہ کھپلی مرتبہ جب میں ان کو اپنے ساتھ یورپ لے گیا تو —“ اور افروز جلدی سے بال روم کے باہر نکل آئی —“ اے یہ زندگی — یہ زندگی کا گھٹیا پن!

واقعی —! یہ زندگی —!!

اور حبشہ نوروز کے دوسرے دن اس بیچارہ ریٹ بٹلر نے اپنے دوست، اس خواب ناک آنکھوں والے ڈریشنگ شہ سوار سے کہا، جو پرستان کے راستوں پر سب سے الگ الگ ٹہلا کرتا تھا — ”عجب لڑکی ہے بھئی۔“

”ہوا کرے۔“ اور وہ خواب ناک آنکھوں والا دوست بے نیازی سے سگریٹ کے دھوئیں کے حلقے بنانا کر چھت کی طرف بھیجتا رہا۔

اور اس عجیب لڑکی کی دوست کہہ رہی تھی: ”ہنہ، اس قدر مغرور مغالطہ فائیڈ قسم کا انسان۔“

”ہوا کرے بھئی۔ ہم سے کیا۔“ اور افروز بے تعلق کے ساتھ ننگ میں مصروف ہو گئی۔

”اتنی ادنیٰ بننے کی کوشش کیوں کر رہی ہو؟“ رخت نے پوچھ کر پوچھا۔

”کیا ہرج ہے۔“

”کوئی ہرج ہی نہیں؟ قسم خدا کی افرودہ اس اویناش کے فلسفے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔“

”تو گویا تمہارے لیے نہ بخیر ملائی جائے۔“

”فہ - جیسے آپ یونہی نو لفت جاری رکھیں گی۔“

”قطعاً۔! زندگی تمہارے لیے ایک مسلسل جذباتی اضطراب ہے لیکن تجھے اصولوں میں رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ جانتی ہو زندگی کے یہ ایئر کنڈیشنڈ اصول بڑے کارآمد اور محفوظ ثابت ہوتے ہیں۔“

”فیہمہ۔ کیا بلند پروازی ہے۔ جی چاہتا ہے خوب پڑ۔“

”میں؟“

”تم اور وہ۔ خدا کی قسم ایسی بے پرواہی سے بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ جی چاہتا ہے پکڑ کر کھا جاؤں اسے۔ جھکنا جانتا ہی نہیں جیسے۔“

”ارے چپ رہو بھائی۔“

”سچ حج اس کی آنکھوں کی گہرائیاں اتنی خاموش، اس کا انسانہ اتنا پروقار، اتنا بے تعلق ہے کہ بعض مرتبہ جی میں آتا ہے کہ بس خود کشی کر لو۔ یعنی ذرا سوچو تو، تم جانتی ہو کہ تمہارے کشن کے نیچے یا مسہری کے سر پرانے میز پر بہترین قسم کی کیڈبری چاکلیٹ کا بڑا سا خوبصورت پکیٹ رکھا ہوا ہے لیکن تم اسے کھا نہیں سکتیں۔ اؤ!“

”کون بھئی۔؟“ پرکاش نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔ ہے۔ ایک۔ ایک۔“ رفعت نے اپنے غصے کی

مطابقت میں کوئی مُوزوں نام سوچنا چاہا۔

”— بلا —“ افروز نے اطمینان سے کہا۔

”بلا!“ پرکاش کافی پریشان ہو گئی۔

”ہاں بھئی — ایک بلا ہے بہت ہی typical قسم کا — ایرانی بلا۔“ افروز

بولی۔

”تو کیا ہوا اس کا؟“ پرکاش نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ہوتا کیا؟ سب ٹھیک ہے بالکل۔ بس ذرا اسے اپنی آنکھوں

پر بہت ناز ہے۔ پچکارنے کی فکر کی جائے تو خرخر کرنے کے بجائے کاٹ کھلنے والا

انداز بناتا ہے۔“

”جج جج جج — اور ان مسعود اصغر صاحب کا کیا ہوگا؟ جو مسوری سے

مار خط پر خط نہایت اسٹائلیش انگریزی میں تمہارے ٹینس کی تعریف میں بھیجا

کرتے ہیں۔“

”ان کو تار دے دیا جائے — Nose upturned — Nose upturned —“

— Riffat:

”ہاں۔ یعنی لفٹ نہیں دیتے۔ جس کی ناک ذرا اوپر کو اٹھی ہوتی ہے

وہ آدمی ہمیشہ بے حد مغرور اور خود پسند طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔“

”تو تمہاری ناک اتنی اٹھی ہوئی کہاں ہے۔“

”قطعی اٹھی ہوئی ہے۔ بہترین پروفائل آتا ہے۔“

”واقعی ہم لوگ بھی کیا کیا باتیں کرتے ہیں۔“

”جناب، بے حد مفید اور عقل مندی کی باتیں ہیں۔“

”اور صلاح الدین بچارہ!“

”وہ تو پیدہ ہی نہیں ہوا اب تک۔“ رفعت نے بڑے رنجیدہ انداز سے کہا۔
 کیونکہ یہ ان کا تخیلی کردار تھا اور خیالستان کے کردار چاند کی وادی میں
 سے کبھی نہیں نکلتے۔ جب کبھی وہ سب کسی پارٹی میں ملیں تو سب سے پہلے انتہائی
 سنجیدگی کے ساتھ ایک دوسرے سے اس فرضی مہتی کی خیریت پوچھی جاتی، اس
 کے متعلق اوٹ پٹانگ باتیں کی جاتیں۔ اور اکثر انھیں محسوس ہوتا جیسے انھیں
 یقین سا ہو گیا ہے کہ ان کا خیالی کردار اگلے لمحے ان کی دنیا اور ان کی زندگی میں
 داخل ہو جائے گا۔

اور فرصت اور بے فکری کی ایک خوش گوار شام انھوں نے یونہی باتیں
 کرتے کرتے صلاح الدین کی اس خیالی تصویر کو مکمل کیا تھا۔ وہ سب شاپنگ
 سے واپس آ کر منظر احمد پیر زور شور سے تبصرہ کر رہی تھیں جو ان سے دیر تک
 آرٹس اینڈ کرلیٹس ایمپوریم کے ایک کاؤنٹر پر باتیں کرتا رہا تھا اور پرکاش
 نے قطعی فیصلہ کر دیا تھا کہ وہ بے حد بنتا ہے اور فروز بے حد پریشان تھی کہ
 کس طرح اس کا یہ مغالطہ دور کرے کہ وہ اسے پسند کرتی ہے۔

”لیکن اسے لفٹ دینے کی کوئی معقول وجہ پیش کرو۔“

”کیونکہ بھی ہمارا معیار اس قدر بلند ہے کہ کوئی مارک تک پہنچ ہی نہیں

سکتا۔“

”لہذا اب کی بار اس کو بتا دیا جائے گا کہ بھی فروز کی تو منگنی ہونے والی ہے۔“

”لیکن کس سے؟“

”یہی تو طے کرنا باقی ہے۔ مثلاً — مثلاً — ایک آدمی سے۔ کوئی نام بتاؤ۔“

”پر دینے۔“

”بڑا عام افسانوی سا نام ہے۔ کچھ اور سوچو!“

”سلامت اللہ!“

”ہنس۔ بھی واہ کیا شان دار نام دماغ میں آیا ہے — صلاح الدین!“

”یہ ٹھیک ہے۔ اچھا اور بھائی صلاح الدین کا تعارف کس طرح کرایا جائے؟“

”بھئی صلاح الدین صاحب جو تھے وہ ایک روز پرستان کے راستے پر شفق

کے گل رنگ سائے تلے مل گئے۔“

”پرستان کے راستے پر؟“

”چٹکی سنتی جاؤ۔ جانتی ہو میں اس قدر بہترین افسانے لکھتی ہوں جن

میں سب پرستان کی باتیں ہوتی ہیں۔ بس پھر یہ ہوا کہ —“

”جناب ہم تو اس دنیا کے باسی ہیں۔ پرستان اور کہانیوں کی پگڈنڈیوں

پر تو صرف ادیناں ہی بھٹکتا اچھا لگتا ہے۔ اور ایک آئی میں بڑی افسانہ

نگار کی دم۔“

”چچ چچ چچ — بیچارہ ادیناں — گڈو۔“

”بھئی ذکر تو صلاح الدین کا تھا۔“

”خیر تو جناب صلاح الدین صاحب پرستان کے راستے پر ہرگز نہیں ملے۔

وہ بھی ہماری دنیا کے باسی ہیں اور ان کا دماغ قطعی خراب نہیں ہوا ہے —

چنانچہ سب ہی میٹر آف فیکٹ طریقے سے —
 ”یہ ہوا کہ افروز دلکش جا رہی تھی تو ریلوے کراسنگ کے پاس بے حد
 رومینٹک انداز سے اس کی کار خراب ہو گئی۔“

”منہیں بھی واقعہ یہ تھا کہ افروز آفیسر نہ شاپ جو گئی ایک روز تو پتا چلا
 کہ وہ غلط تاریخ پر پہنچ گئی ہے اور وہ اپنا کارڈ بھی گھر بھول گئی تھی۔ بس
 بھائی صلاح الدین جو تھے انھوں نے جب دیکھا کہ ایک خوبصورت لڑکی برگنڈی
 رنگ کا کیوٹس نہ ملنے کے غم میں رو پڑنے والی ہے تو انہوں نے بے حد gallantly
 آگے بڑھ کر کہا کہ ”خاتون میرا آج کی تاریخ کا کارڈ بیکار جا رہا ہے، اگر آپ چاہیں۔“
 ”بہت ٹھیک۔ آگے چلو۔ پھر کیا ہونا چاہیے؟“ ”بس وہ پیش ہو گئے۔“ ”نہ پیش
 نہ زبرد نہ زبرد۔ افروز نے فوراً فوٹو کر دیا اور وہ بچارے دل شکستہ ہو گئے۔“

”اچھا ان کا کیرئیر —“

”بہت ہی بیش فل۔“

”ہرگز نہیں۔ کافی تیز — لیکن بھی ڈینڈی قطعی نہیں برداشت کیے
 جابیں گے۔“

”قطعی نہیں صاحب — اور اگر فلٹ ہوں تو تھوڑے سے —“

”تو کوئی مضائقہ نہیں — اچھا وہ کرتے کیا ہیں؟“

”مجھے ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی کرتے ہوں گے!“

”آر می میں رکھ لو۔“

”ادوق — حد ہو گئی تمہارے اسٹنٹ کی۔ کچھ سول سروس وغیرہ لاؤ۔“

”سب بور ہوتے ہیں۔“

”اے ہم بنائیں کچھ کرتے کرتے نہیں۔ منظر احمد کی طرح تعلقہ دار ہیں۔
پچیس گاؤں اور ایک مہی روٹنگ سہی جہاں پر وہ کرمس کے زمانے میں اپنے
دوستوں کو مدعو کیا کرتے ہیں۔ ماں اور ایک شاندار سی اسپورٹس کار۔“
”لیکن بھئی اس کے باوجود بے انتہا قومی خدمت کرتا ہے۔ کیونسٹ قسم کی
کوئی مخلوق۔“

”کیونسٹ ہے تو اسے اپنے پچیسوں گاؤں عیثیٰ کر دینے چاہئیں مگر نہ
پرائیویٹ پراپرٹی۔“

”واہ، اچھے بھائی بھی تو اتنے بڑے کیونسٹ ہیں۔ انہوں نے کہاں اپنا
تعلقہ چھوڑا ہے؟“

”آپ تو چغند ہیں نشاط زریں۔ اچھے بھیا تو سچ حج کے آدمی ہیں۔ ہیرو
کو بے حد آئیڈیل قسم کا ہونا چاہیے۔ یعنی غور کرو کہ صلاح الدین محمود کس قدر
بلند پایہ انسان ہے کہ جنتا کی خاطر۔“

”افوہ۔ کیا بریت ہے بھئی۔ تم سب مل کر ابھی یہی طے نہیں کر پائیں کہ
وہ کرتا کیا ہے۔“

”کیا بات ہوئی ہے واللہ!“

”جلدی بتاؤ۔“

”اصفہانی پائے میں۔“

اور سب پر مہنگا پانی پڑ گیا۔

”کیوں جناب اصفہان میں تو بڑے بڑے اسمارٹ لوگ دیکھنے میں آتے ہیں۔“
 ”اچھا بھئی قصہ مختصر یہ کہ پڑھتا ہے۔ فرکس مین ریسرچ کر رہا ہے گویا۔“
 ”پڑھتا ہے تو آفیسر نشاپ میں کہاں سے پہنچ گیا!“
 ”بھئی ہم نے فیصلہ کر دیا ہے آخر۔ ہوائی جہاز میں سول ایوی ایشن آفیسر
 ہے۔“

”یہ ایڈیٹیا کچھ —“

”تمہیں کوئی ایڈیٹیا ہی پسند نہیں آتا۔ اب تمہارے لیے کوئی آسمان سے
 تو خاص طور پر بن کے آئے گا نہیں آدمی۔“
 ”اچھا تو پھر یہی مسئلہ بولے ٹیکسٹ ڈور جو غور کے مارے اب تک ڈیڈی
 پر کال کرنے نہیں آئے۔“

— اور اس طرح انھوں نے ایک تخیلی کردار کی تخلیق کی تھی۔ سب ہی
 اپنے دلوں میں چپکے چپکے ایسے کرداروں کی تخلیق کر لیتے ہیں جو ان کی دنیا میں نہ
 بنے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ یہ بیچارے بیوقوف لوگ !!

لیکن پرکاش کا خیال تھا کہ ان کی Mad-hatter's پارٹی میں سب کے سب
 حد سے زیادہ عقل مند ہیں۔ مغرور اور خود پسند۔ نشا طرز میں جو ایسے fantastic
 افسانے لکھتی ہے جن کا سر پر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا لیکن جن کی تعریف ایسی کیٹ
 کے اصولوں کے مطابق سب کر دیتے ہیں۔ جو اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پر الجھ کر
 بچوں کی طرح رو پڑتی ہے یا خوش ہو جاتی ہے اور پھر اپنے آپ کو سپراسٹیکچورل
 سمجھتی ہے۔ رفعت، جس کے لیے زندگی ہمیشہ ہنستی اور ناچتی رہتی ہے۔ اور

افروزہ جو نہایت سنجیدگی سے نو لفظ کے فلسفے پر تھیسس لکھنے والی ہے کیونکہ ان کی پارٹی کے دس احکام میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انسان کو خود پسند، خود غرض اور مغرور ہونا چاہیے کیونکہ خود پسندی و ماعنی صحت مندی کی سب سے پہلی علامت ہے۔

ایک سہ پہر وہ سب اپنے امریکن کالج کے طویل درجیچوں والے فرانسیسی وضع کے میوزک روم میں دوسری لڑکیوں کے ساتھ پیانو کے گرد جمع ہو کر سالاہ کو نسرٹ کے ادپیرا کے لیے ریہرسل کر رہی تھیں۔ موسیقی کی ایک کتاب کے ورق اٹھتے ہوئے کسی جرمن نغمہ نواز کی تصویر دیکھ کر پرکاش نے بے حد ہمدردی سے کہا: ”ہمارے ادینا ش مہائی بھی تو اسکارف، لمبے لمبے بالوں، خواب ناک آنکھوں اور پاپ کے دھڑیس سے ایسا بوہیمین انداز بناتے ہیں کہ سب ان کو خواہ مخواہ جینیس سمجھنے پر مجبور ہو جائیں۔“ ”اُدھی کبھی جینیس ہو ہی نہیں سکتا۔“ نشاط اپنے فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ”اب تک جتنے جینیس پیدا ہوئے ہیں سارے کے سارے بالکل girlish تھے اور ان میں عورت کا عنصر قطعی طور پر زیادہ موجود تھا۔ بائرن، شیلے، کیٹس، شوپاں — خود آپ کا نیولین اعظم لڑکیوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا تھا۔“ رفعت امریش دریچے کے قریب زور زور سے ”میں نے خواب میں دیکھا کہ مرمریں ایوانوں میں رہتی ہوں“ گانے کی مشق کر رہی تھی۔ باہر برآمدے کے یونانی ستونوں اور باغ پر دھوپ ڈھلنا شروع ہو گئی۔ ”سپرب، میری بچیو! ہماری ریہرسلیں بہت اچھی طرح پروگرس کر رہی ہیں۔“ اور موسیقی کی فرانسیسی پروفیسر اپنی مٹھن اور

شیریں مسکراہٹ کے ساتھ میوزک روم سے باہر جا کر برآمدے کے ستونوں کے طویل سیالوں میں کھو گئیں۔ نشاط نے اسی سکون اور اطمینان کے ساتھ بیاؤ بند کر دیا۔ زندگی کتنی دلچسپ ہے، کتنی شیریں۔ درپچے کے باہر سائے بڑھ رہے تھے۔ فہنا میں ”لابویم“ کے نعموں کی گونج اب تک رقصاں تھی۔ چاروں طرف کالج کی شاندار اور وسیع عمارتوں کی قطاریں شام کے دھندلکے میں چھپتی جا رہی تھیں۔ میرا پیارا کالج، ایشیا کا بہترین کالج، ایشیا میں امریکہ، لیکن اس کا اسے اس وقت خیال نہیں آیا۔ اس وقت اسے ہر بات عجیب معلوم نہیں ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی ہم کتنے اچھے ہیں۔ ہماری دنیا کس قدر مکمل اور خوش گوار ہے۔ اپنی معصوم مسرتیں اور تفریحیں، اپنے رفیق اور ساتھی، اپنے ایڈیٹیل اور نظریے اور اسی خوبصورت دنیا کا عکس وہ اپنے افسانوں میں دکھانا چاہتی ہے تو اس کی تحریروں کو *fantasy* اور مصنوعی کہا جاتا ہے۔ بچاری میں !! موسیقی کے اوراق سیٹھے ہوئے اسے اپنے آپ سے ہمدردی کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی۔ اس نے ایک بار ادیناش کو سمجھایا تھا کہ ہماری شریعت کے دس احکام میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہمیشہ اپنی تعریف آپ کرو۔ تعریف کے معاملے میں کبھی دوسروں پر بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔ محفوظ ترین بات یہ ہے کہ وقتاً فوقتاً خود کو یاد دلاتے رہا جائے کہ ہم کس قدر بہترین ہیں۔ ہم کو اپنے علاوہ دنیا کی کوئی اور چیز بھی پسند نہیں آسکتی کیونکہ خود بادلوں کے محلوں میں محفوظ ہو کر دوسروں پر ہنسنے رہنا بے حد دلچسپ مشغلہ ہے۔ زندگی ہم پر ہنستی ہے، ہم زندگی پر ہنستے ہیں۔ ”اور پھر زندگی اپنے آپ پر ہنستی ہے“ بچارے ادیناش نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تھا۔ اور اگر افروز کا خیال تھا کہ وہ

اس دنیا سے بالکل مطمئن نہیں تو پرکاش اور نشاطِ ندریں کو، جو دونوں بے حد عقل مند تھیں، قطعی طور پر یقین تھا کہ یہ بھی ان کی Mad-hatter's پارٹی کی cynicism کا ایک خوبصورت اور فائدہ مند پوز ہے۔

— اور سچ سچ افروزہ کو اس صبح محسوس ہوا کہ وہ بھی اپنی اس دنیا، اپنی اس زندگی سے انتہائی مطمئن اور خوش ہے۔ اس نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اس کے کمرے کے مشرقی درپچے میں سے صبح کے روشن اور جھللاٹے ہوئے آفتاب کی کرنیں چھین چھین کر اندر آ رہی تھیں۔ امد کرے کی ہلکی گلابی دیواریں اس نارنجی روشنی میں جگمگا اٹھی تھیں۔ باہر درپچے پر چھائی ہوئی بیل کی سرخ پھولوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی لمبی لمبی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل ہل کر درپچے کے شیشوں پر اپنے سائے کی آڑھی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔ اس نے کتاب بند کر کے قریب کے صوفے پر پھینک دی اور ایک طویل انگڑائی لے کر مسہری سے کود کے نیچے اتر آئی۔ اس نے دقت دیکھا۔ صبح جاگنے کے بعد وہ بہت دیر تک پڑھتی رہی تھی۔ اس نے غسل خانے میں گھس کر کالچ میں ایسٹج ہونے والے ادبیرا کا ایک گیت گاتے ہوئے منہ دھویا اور تیار ہو کر میز پر سے کتابیں اٹھاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ کلاس کا وقت بہت قریب تھا۔ اس نے برساتی سے نکل کر ذرا تیزی سے لائن کو پار کیا اور پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے دیکھا کہ باغ کے راستے پر سبزے کے کنارے اس کا مینڈ وروز کی طرح دنیا جہان سے قطعی بے نیاز اور صلح کل انداز میں آنکھیں نیم واکھے دھوپ سینک رہا تھا۔ اس نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس کے لمبے لمبے سفید ریشمیں بالوں پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے محسوس کیا، اس نے دیکھا کہ دنیا کتنی روشن، کتنی خوبصورت ہے۔ باغ کے پھول، درخت، پتیاں، شاخیں اسی سنہری دھوپ میں نہا رہی تھیں۔ ہر چیز تازہ دم اور لبّاش ہتی۔ کھلی نیلگوں فضاؤں میں سکون اور مسرت کے خاموش راگ چھڑے ہوئے تھے۔ کائنات کس قدر پرسکون اور اپنے وجود سے کتنی مطمئن تھی۔ دور کو مٹھی کے احاطے کے پچھلے حصے میں دھوبی نے باغ کے حوض پر کپڑے پٹختے شروع کر دیے تھے اور نوکروں کے بچے اور بیویاں اپنے کوارٹروں کے سامنے گھاس پر دھوپ میں اپنے کاموں میں مصروف ایک دوسرے سے بڑتے ہوئے شور مچا رہی تھیں۔ روزمرہ کی یہ مانوس آوازیں یہ تجویب اور عزیز فضا میں — یہ اس کی دنیا تھی، اس کی خوبصورت اور مختصر سی دنیا۔ اور اس نے سوچا کہ واقعی یہ اس کی حماقت ہے اگر وہ اپنی اس آرام دہ اور پرسکون کائنات سے آگے نکلنا اور سایوں کی اندھیری وادی میں جھانکنا چاہتی ہے۔ ایسے adventure ہمیشہ بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ اس نے مینڈو کو پیار کر کے اس کی جگہ پر بٹھا دیا اور آگے بڑھ گئی۔ باغ کے احاطے کے دوسری طرف انگریز ہمسائے کا بچہ مکمل داؤدی کی کیاریوں کے کنارے کینارے اپنے لکڑی کے گھوڑے پر سوار دھوپ میں جھلملاتے پروں والی تیرہ یوں کو کپڑے کی کوشش کرتے ہوئے خوب نہور نہور سے گارہا تھا "Ah ! this bootiful, bootiful world!" اس نے سوچا: ٹل مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور، خوب گاؤ! اور اپنے لکڑی کے گھوڑے پر خیالی مہمیں سر کرتے ہو۔ ایک وقت آئے گا جب تمہیں پتا چلے گا کہ دنیا کتنی بوٹی فل ہے۔

اور امرودوں کے جھنڈ کے اس پار کالج کے میوزک روم میں تیزی سے
ریکارڈ بچے شروع ہو گئے اور اسے یاد آ گیا کہ کالج سے واپسی پر اسے اد پیرا کے
علامہ بنگال ریلیف کے ورائٹی شو کی ریمپس کے لیے بھی جانا ہے اور وہ تیز تیز
قدم اٹھانے لگی۔ شام کو پروگرام ختم ہوا اور چاروں طرف زور شور سے اس کے
انتظامات کیے جا رہے تھے۔ بنگال کا قحط ان دنوں اپنی انتہا پر پہنچا ہوا تھا اور
ہر لڑکی اور لڑکے کے دل میں کچھ نہ کچھ کرنے کا سچا جوش موجزن تھا۔

ملک فروخت کرنے کے لیے سائیکلوں پر رسول لائسنز کی کوٹھیوں کے چکر لگائے
جا رہے تھے۔ مشاعرے کے انتظام کے سلسلے میں بار بار ریڈیو اسٹیشن پر فون کیا جا
رہا تھا کیونکہ اسی ہفتے ریڈیو پر مشاعرہ ہوا تھا جس کی شرکت کے لیے بہت سے مشہور
ترنم سے پڑھنے والے شعراء کرام تشریف لے آئے تھے۔ میوزک روم کے پیچھے کے
اور چھڑ میں بہت سی لڑکیاں ایک درخت کے نیچے انتہائی انہماک سے مختلف کاموں
میں مصروف تھیں۔ کچھ پروگرام کے خوبصورت کاغذوں پر پینٹنگ کر رہی تھیں،
کچھ قہقہے لگا لگا کر اس افتتاحیہ نظم کی تک بندی کر رہی تھیں جو پروگرام شروع
ہونے پر قوالوں کے انداز اور انہی کے بھیس میں گائی جانی تھی۔ پتھوری دیر
بعد وہ بھی ان میں شامل ہو گئی۔ ”اور سہارے سپر جینیس گروپ کے باقی افراد
کہاں رہ گئے؟“ سعیدہ نے پوچھا۔

”پرکاش تو آج کل ہمارے اور اویناش کے ساتھ ہندوستان آنا کوڑے میں سخت
مصروف ہے۔ اور درخت دنیا کی بے ثباتی پر غور کرنے کے بعد حجت میں مبتلا
ہو گئی ہے۔“

”باپجاری — اور ہمارا زبردست ادیب، مصوّر اور فسانہ نگار ابھی تک نہیں

پہنچا۔“

”اگئے ہم —“ نشاط نے درخت کے نیچے پہنچ کر اپنی جاپانی چھتری بند

کرتے ہوئے کہا۔

”خدا کا شکر ادا کر بھائی، جس نے ایسا ادیب بنائی۔“ جلیس ایک تلابازی

کھا کر بولی، ”چلو اب توّالی مکمل کریں۔“ اور ہنس ہنس کر بوٹے ہوئے قوالی

تیار کی جانے لگی۔ کیسے بے ٹیکے اور دلچسپ شعر تھے: ”وہ خود ہی نشانہ بنتے ہیں“

ہم تیر چلانا کیا جانیں — وہ بنے بنائے پاگل ہیں، ہم پاگل بنانا کیا جانیں

۔۔ اور سٹی کے پڑھنے والے ہم گانا بجانا کیا جانیں۔“ اور جانے کیا کیا۔

کتنی خوش تھیں وہ سبب — دندگی کی یہ معصوم، شریہ، چھوٹی

چھوٹی مسرتیں!!

اور اس وقت بھی دنیا اتنی ہی خوبصورت اور روشن تھی جب کہ غروب ہوتے

ہوئے سورج کی ترچھی ترچھی نارنجی کرنیں اس کے درتچے میں سے گزرتی ہوئی

گلابی دیواروں پر ناچ رہی تھیں اور وہ کتابوں کی الماریوں اور سنگھار میز کی صفائی

کرنے کے بعد صوفے کو درتچے کے قریب کھینچ کر شال میں لپیٹی ہوئی کلاس کے نوٹس

پڑھنے میں مصروف تھی۔ باہر فضا پر ایک آرام دہ، لطیف اور پرسکون خاموشی

چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد دورِ حال پر سے گزرتی ہوئی کاروں

کے طویل مارن سنائی دے جاتے تھے۔ دوسرے کمرے میں رفعت آہستہ آہستہ کچھ

گگارہی تھی اور مسٹر بولے نیکسٹ فور کے برآمدے میں مدھم مدھم میں گتار بج رہا

تھا۔

اس نے کشن پر سر رکھ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ فرست، اطمینان اور سکون کے یہ لمحات۔ کیا آپ کو ان لمحوں کی قدر نہیں جو ایک دفعہ افق کی پہاڑیوں کے اس پار اڑ کر چلے جائیں تو پھر کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ وہ لمحے جب جاڑوں کی راتوں میں ڈرائنگ روم کے آئینہ کے سامنے بیٹھ کر کشمش اور چلغوزے کھاتے ہوئے گپ شپ اور scandal mongering کی جاتی ہے۔ وہ لمحے جب دھوپ میں ایک لذیذ کاہلی کے احساس کے ساتھ سہرے پر بلیوں کی طرح لوٹ لگا کر ریکارڈ بچائے جاتے ہیں اور لڑا جاتا ہے۔ اور پھر ایسے میں اسی طرح کے بیٹے ہوئے وقتوں کی یاد اور یہ احساس کہ اپنی حماقت کی وجہ سے وہ وقت اب واپس نہیں آ سکتا، کس قدر تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔

درتچے کے نیچے روش پر میوٹر بائیک رکھنے کی آواز آئی۔ اس نے کشن پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ شاید چہرہ آیا تھا۔ رفعت دوڑتی ہوئی برآمدے کی سیڑھیوں پر سے اتر کے باغ میں چلی گئی۔ اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں اور اس کے درتچے کے سامنے روش پر سے وہ سب گزرنے لگے۔ وہ بچارے فریب خوردہ انسان جنہیں زندگی نے رنجیدہ کیا، زندگی جن کی وجہ سے غمگین ہوئی۔ لیکن پھر بھی وہ سب وہاں موجود تھے۔ اس کے خیالوں میں آنے پر مصر تھے۔ اسے شاید یاد آیا۔ اور اس کے سارے بھائی — دور دراز کی یونیورسٹیوں اور میڈیکل کالجوں میں پڑھنے والے یہ شریر، خوبصورت اور ضدی افسانوی سے رشتے کے بھائی، جو چپٹیوں میں گھر آتے ہیں اور ان کے رشتے کی بہن یا ان کی بہنوں کی سہیلیا

ان کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ وہ ان سے لڑتے ہیں، راتوں کو باغ میں چاند کو دیکھا جاتا ہے، پھر وہ ان سب کو دل شکستہ چھوڑ کر یا جنگ پر چلے جاتے ہیں یا ان میں سے کسی ایک سے شادی ہو جاتی ہے۔ اُف یہ حماقتیں۔!!

اور اسے وہ باتیں یاد کر کے ان سب پر بے اختیار ترس سا آ گیا۔ یہ فریب

کاریاں، یہ بے وقوفیاں!!

اور اسے یاد آیا — فرصت اور بے فکری کے ایسے ہی لمحوں میں ایک مرتبہ اپنے اپنے مستقبل کی تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ سارے مہینہ بھائی ایک جگہ جمع ہو گئے تھے۔ دن بھر تصویریں اتاری جاتی تھیں۔ بزرگوں سے نظر بچا کر سینٹری میں سے علوہ اور انس کریم لڑائی جاتی تھی۔ بے نیکی شاعری ہوتی تھی۔ اس نے کہا تھا: ”اب بھی اسلم کا حشر سنیے۔ جب آپ پاس کر کے نکلیں گے تو ہو جائیں گے ایک دم سے لفٹنٹ، پیر کیپٹن، پھر میجر۔ ڈاکروں کو بڑی جلدی جلدی ترقی دی جاتی ہے۔ بس — اور جناب اس قدر خوش کہ دنیا کی ساری لڑکیاں آپ پر پیش ہیں۔ بال میں جارہے ہیں، پکچرز میں لڑکیاں اچک اچک کر آپ کی زیارت کر رہی ہیں، چاروں طرف برف کی سفید سفید گڑیوں جیسی، انگارہ سے سرخ ہونٹوں والی نرسیں بھاگی پھر رہی ہیں۔ چھٹی پر گھبراتے ہیں تو سب کا انتقال ہوا جا رہا ہے اور آپ مارے شان کے کسی کو لفٹ ہی نہیں دیتے۔ سٹیس یا بل کے ماں بہترین پونز کی بہت سی تصویریں کھجوالی ہیں اور وہ اپنی ایڈ مائررز کو عنایت کی جا رہی ہیں۔ پھر بھائی لڑائی کے بعد جو آپ کو کان پکڑ کر نکال کے باہر کھڑا کر دیا جائے گا کہ بھیا گھر کا راستہ تو جناب آپ امین آباد کے

پیچھے ایک پھٹیچر سامیٹہ کیل ہال کھول کر بیٹھیں گے۔ اب بھابی اُسلم بھابی نہیں کہ ایک بدرنگ سی کسی پر بیٹھے مکھیاں مار رہے ہیں۔ کوئی مُریفی اُکے ہی نہیں دیتا۔ پھر بھی ایک روز کو ناخدا کا کیا ہوگا کہ ایک شاندار بیوک رُکے گی آپ کی دکان کے آگے اور اس میں سے ایک بے حد عظیم الشان خاتون ناک پر رومال رکھے انزکرو چھیں گی کہ بھئی ہمارے بلنڈ کو کوڑا کام ہو گیا ہے۔ یہاں کوئی گھوڑا ہسپتال کا ڈاکٹر۔“

اور اُسلم نے کہا تھا: ”ہمش، چپ رہو جی۔ بیگ صاحبہ ہو کس خیال میں۔ بندہ تو ہو جائے گا لفٹننٹ کرنل تین سال بعد۔ اور رُطانی کے بعد ہوتا ہے سول سرجن۔ اور بھی کیا ہوگا کہ ایک روز بی افروز اپنے پندرہ بچوں کی ملیں لیے بی گاڑی میں چلی آ رہی ہیں اور سامنے گاڑی بان کے پاس بیڑا سا زرد پگڑیا بندھے اور ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا لیے بی افروز کے راجہ بہادر بیٹھے ہیں۔ اور بھی ہم چیراؤسی سے کہلوادیں گے کہ سول سرجن صاحب معائنہ کرنے تشریف لے گئے ہیں، شام کو آئے گا۔ اب جناب افروز بیگم برآمدے میں بیٹھی ہیں برقعہ پہنے۔“

”بائے چپ رہو بھئی۔ خدا نہ کرے جو زرد پگڑیا اور بیل گاڑی! اور کیا، منظر احمد سے جو تم شادی کرو گی تو کیا روس رائس چلا کرے گی تمہارے یہاں؟ بیل گاڑیوں پر ہی پڑی جایا کرنا اپنے گاؤں۔“

”بیل گاڑی پر جانا تم اور زرد پگڑیا بھی خدا کرے تم ہی باندھو۔ آئے وہاں سے بڑے بچارے۔“

”اور بھی حضرت داغ کا یہ ہوگا۔“ شاہد نے اپنے مخصوص انداز سے

کہنا شروع کیا تھا، ”کہ یہ خاکسار جب کئی سال تک ایم۔ ایس۔ سی میں لڑھک چکے گا تو وارٹیکنیشنز میں بھرتی ہو جائے گا اور پھر بی رفعت کی کوٹھی پر پہنچے گا کہ بھیڑ بڑے دن کے سلام کے لیے آئے ہیں۔ صاحب کہلو ادیں گے کہ پھر آنا، صاحب کلب گئے نہیں۔ بس بھیڑ ہم وہاں برساتی کی سیڑھیوں پر، گملوں کی اڑیلیں، اس امید پر بیٹھ جائیں گے کہ شاید بی رفعت نکلی آتی اندر سے۔ لیکن جب چپراسی کی ڈانٹ پڑے گی تو چلے آئیں گے واپس اور کوٹھی کے پھاٹک کے باہر پہنچ کر کان میں سے چوٹی نکال سگریٹ اور دو پیسوں والی سینما کے گلفے کی کتاب خرید کے گاتے ہوئے گھر کا راستہ لیں گے۔ اُنکیاں ملا کے — جیا برما کے — چلے نہیں جانا۔“

”نہیں بھیڑ، خدا نہ کرے، ایسا کیوں ہو! اتم تو پروگرام کے مطابق اعلیٰ درجے کے فلرٹ بنو گے اور ریلوے کے اعلیٰ انجنیئر۔ اپنے ٹھاٹ سے سیلون میں سیر کرتے پھرا کر و گئے۔“ رفعت نے کہا تھا۔

باغ میں سے رفعت کے مدھم قہقہوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ جو کچھ انھوں نے مذاق مذاق میں سوچا تھا وہ نہیں ہوا۔ وہ کبھی بھی نہیں ہوتا۔ اور اسلم اور اس کی کچھی ہوئی راجہ بہادر کی تصویر اس کی آنکھوں میں ناچنے لگی۔

اسلم، جو میدان جنگ میں جا کر عرصہ ہوا لاپتہ ہو چکا تھا اور منظر احمد، جو اس شام آرٹس اینڈ کرفٹس ایمپوریم کے بڑے بڑے شیشوں والی جھلکاتی ہوئی گیلری میں سے نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں: ہمیں اپنے خیالوں سے بھی یونہی نکال دو تو جانیں!

اور باغ میں اندھیرا چھانے لگا۔ گتار بجاتا رہا۔ اور افروز سوچتی رہی :
 زندگی کے یہ مذاق ! اس روز ”یوم ٹیگور“ کے لیے ریڈیو اسٹیشن کے آرکیسٹر
 کے ساتھ رقص کی رسی ہرسل کرنے کے بعد وہ پرکاش اور اجلا کے ساتھ دہاں
 واپس آ رہی تھی اور لیلیا رام کے سامنے سے وہ اپنی اسپورٹس کار پر تاناظر آیا
 تھا۔ پرکاش کو دیکھ کر اس نے کار روک لی تھی : ”کیسے مس شیراے کیا ہو
 رہا ہے ؟“ ”گھر جا رہی ہیں۔“ ”چلیے میں آپ کو پہنچا دوں۔“

اور افروز نے کہنا چاہا تھا کہ ہماری کار آتی ہوگی، آپ تکلیف نہ کیجیے۔
 لیکن پرکاش نے اپنی مثالی خوش خلقی کی وجہ سے فوراً اس کی درخواست قبول
 کر لی تھی اور پھر اس کے گھر تک وہ کار پندرہ میل کی رفتار سے اس قدر آہستہ
 ڈرائیو کر کے لایا تھا جیسے کسی بارات کے ساتھ جا رہا ہو، محض اس لیے کہ
 اسے افروز کو اپنی کار میں زیادہ سے زیادہ دیر تک بٹھانے اور اس سے باتیں
 کرنے کا موقع مل سکے۔ اور اس نے سوچا تھا کہ اگر وہ اس شطراحمہ کو بہت زیادہ
 پسند نہیں کرتی تو بہر حال مائٹڈ بھی نہیں کرے گی، حالانکہ اسے ابھی طرح معلوم
 تھا کہ وہ اعلیٰ قسم کا فلرٹ ہے، کبھی کبھی ڈنک بھی کر لیتا ہے اور نشاط نے تو
 یہ ناک کہا تھا کہ اپنی ریاست میں اس کی کپیپ بھی موجود ہے۔ ”لیکن ابھی کیا
 تعجب ہے ؟“ نشاط کہہ رہی تھی، ”سب ہی جانتے ہیں کہ یہ تعلقہ داروں کے
 لڑکے کیسے ہوتے ہیں۔“

اور پھر ایک روز وہ اور پرکاش خریداری کے بعد کافی لائوٹس چلی گئیں۔ دوپہر
 کا وقت تھا۔ برسات کی دوپہر ! بارش ہو کر رہ گئی تھی۔ فضا پر ایک لطیف سی

خنکی چھپائی ہوئی تھی۔ کافی ماؤس میں بھی قریب قریب بالکل سناٹا تھا۔ وہ ایک ستون کی اڑ میں بیٹھ گئیں اور سامنے کے مرمرین ستون پر لگے ہوئے بڑے آئینے میں انھوں نے دیکھا کہ دوسری طرف منظر احمد بیٹھا ہے۔ خوب! یہ حضرت دوپہر کو بھی کافی ماؤس کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ اس نے ذرا نفرت محسوس کرنے کی کوشش کی۔ اور پرکاش کو دیکھ کر وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا ان کی میز پر بیٹھا۔ ”ہلو۔۔۔ افروز سلطانہ۔۔۔ ہلو۔۔۔“ اس نے اپنے لہجے میں بقدر ضرورت خنکی اور خنکی پیدا کرتے ہوئے مختصر سا جواب دے دیا اور کافی بنانے میں مشغول ہو گئی۔ وہ اپنی تخیلی سی آنکھوں سے باہر کی طرف دیکھتا رہا۔ اس وقت وہ غیر معمولی طور پر خاموش تھا۔ افوہ! کتنا ہنسا ہے۔ یہ شخص بھی کبھی سنجیدہ ہو سکتا ہے جس کی دندگی کا واحد مقصد کھیلنا اور صرف کھیلتے رہنا ہے؟

پرکاش خریداری کی فہرست بنانے میں منہمک تھی۔ پھر وہ ایک تخت کہنے لگا: ”افروز سلطانہ! آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتیں؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے دل میں میری طرف سے بڑی خوفناک قسم کی بدگمانیاں پیدا کر دی گئی ہیں۔“

”جی جھے بدگمانی وغیرہ کی قطعی ضرورت نہیں۔ بدگمانیاں تو اسے ہو سکتی ہیں جسے پہلے سے آپ کی طرف سے حسرت ظن ہو۔ یہاں آپ سے دلچسپی ہی کس کو ہے؟“

”ہنہ۔۔۔ ذرا بننا تو دیکھو۔“ وہ کہتا رہا: ”میں نے سنا ہے کہ آپ کو بتایا گیا ہے کہ میں۔۔۔ میں ڈرک کرتا ہوں۔ اور۔۔۔ اور اسی قسم کی مہبت

سی حرکتیں — مختصر یہ کہ میں انتہائی بڑا آدمی ہوں — کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ باتیں صحیح ہو سکتی ہیں؟ کیا آپ مجھے واقعی ایسا ہی سمجھتی ہیں؟“ اور اس نے آہستہ آہستہ بڑی رو میںٹک نقرئی آواز میں بات ختم کر کے سگریٹ کی راکھ جھٹکی اور پام کے پتوں کے پرے دیکھنے لگا — اور وہ سچ سچ مہبت پریشان ہو گئی کہ کیا ہے کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ منظر احمد اس وقت بقول شخصے قطعی نوں سیریں نہیں ہے۔ اور اس نے کہا: ”بھئی میں نے قطعی کوئی ضرورت نہیں سمجھی کہ آپ کے متعلق —“ ”اچھا، یہ بات ہے۔“ اس نے بات ختم کرنے کا انتظار کیے بغیر اسی نقرئی آواز میں آہستہ سے کہا، ”اجازت دیجیے، خدا حافظ مس شیر لے —“ اور وہ ایک دم سے اس کی میز پر سے اٹھ کر چلا گیا اور کرلی لوکس کشنوں کے انبار پر سے گر پڑی۔ ”جناب تشریف لے گئے۔“ پرکاش نے فہرست کے کاغذ پر سے سیر اٹھا کر پوچھا۔ باہر آگست کی ہوائیں ہال کے بڑے بڑے دریچوں کے شیشوں سے ٹکراتی رہیں۔

رات کی تاریکی باغ پر پھیل گئی۔ مہرہ کی گرگڑاتی ہوئی موٹر بائیک روش پر سے گزر کر باہر ہال کے طویل اندھیرے میں کھو چکی تھی۔ نشاط اور رفعت باتیں کرتی اور گنگنائی ہوئی کمرے میں آگئیں۔

”جناب! بہترین اوپیرا ہے گا۔“ رفعت کہہ رہی تھی۔

”اور سہارا تازہ افسانہ جو اس قدر سیرب تھا۔ اب ہماری کتاب کارڈیو پر بقول شخصے بڑا شاندار ریویو کیا جائے گا۔“ نشاط صوفے پر کودتے ہوئے بولی۔

”من ترا سپر جنیس بگویم — تم ہر مکے انگریزی رسالے میں اپنے اوپیرا کی بہت سی تعریف کر دینا۔“ رفعت نے کہا۔

”ہاں یہ تو کریں گے ہی۔“ نشاط جیسے یہ پہلے طے کر چکی تھی۔
 ”بھئی ریڈیو اسٹیشن پر آج کل سب ایک سے ایک دانش آؤٹ نظر آتے ہیں، کیا کیا جائے۔“ رفعت اکتا کر بولی۔

”اور شاہد بچارہ زخمی ہو گیا۔“ نشاط نے اور بھی زیادہ اکتا کر کہا۔
 ”ممی کہہ رہی تھیں کہ محاذ پر لگیں سے اس کی آنکھیں خراب ہو گئیں۔“
 ”ہا — ہج — ہج — کافی خوبصورت آنکھیں تھیں اس بچارے کی۔“
 اور تھوڑی دیر بعد اوپیرا کے اطالوی رقص کی مشق کے لیے پرکاش اور اس کے ساتھ بہت سی لڑکیاں آگئیں اور وہ سب ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔
 (افروند کے کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ دور، زندگی کی fantasy پر، دھندلی دھندلی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔

پھر شوپان کی موسیقی فضا میں لہرا اٹھی۔ اس رات اوپیرا شروع ہو چکا تھا اور تارکی کے پیروں پر تیزی سے اڑتی ہوئی ساعتوں کے ساتھ ساتھ ختم ہو رہا تھا۔
 قص گاہ کے جگمگاتے دریچوں پر پردے گرے جا رہے تھے۔ یو کلیٹس کی اونچی اونچی شانوں سے بھگتی رات کا تنہا اور خشک چاند لال کے پچھلے دریچے میں سے اندر جھانک کر اوپیرا کا آخری نغمہ سننے کی کوشش کر رہا تھا، پیانو کے گہرے بھاری سروں کا منہ، جس کی لہریں جھللا تھر تھر ہوئے غنائی تھیں پیروں کے نیچے ڈوبتی جا رہی تھیں۔
 اور فٹ لائٹ کی تیز سفید کرنوں سے جگمگاتی اسٹیج پر نقری شیفون میں ملبوس

سیاہ آنکھوں والی لڑکیوں کی ایک قطار ہاتھوں میں سنہری اور سیاہ پنکھیاں لیے ہوئے آئی اور دوسری طرف سے اطالوی gallants کا ایک پڑا داخل ہوا جن کی ٹوپیل میں لمبے لمبے خوبصورت پرشامانہ انداز سے سجے ہوئے تھے اور جن کی روپیلی تلواریں اسٹیج کی روشنی میں جھللا رہی تھیں۔ انھوں نے دوزانو جھک کر سینوزیتاؤں سے رقص کی درخواست کی۔ سٹریخ گلابوں کے گچھے پھینکے گئے اور آرکیسٹرا کی ایک گونج دار دھمک کے ساتھ آخری رقص شروع ہو گیا۔ پھر تیزی سے گھومتے ہوئے رنگین سیالوں، چکر کاٹتے ہوئے پروں اور تیز گرم موسیقی کے اس پیرنشور بھنور کی لہریں آہستہ آہستہ پھیلی گئیں اور رقص کی رفتار دھیمی ہو کر پردے کے پیچھے سے بلند ہونے والے آخری سٹروں کی گونج میں ڈوب گئی۔

ہال روشنیوں سے جاگ اٹھا اور سٹریخ کشوں پر بیٹھے، دبی دبی جامیاں لپیٹے ہوئے تماشا ٹی جیسے ایک طویل خواب سے چونک کر ایک بار پھر اپنی دنیا میں واپس آ گئے اور بھاری بھاری قدموں خمار آلود آنکھوں کے ساتھ ہال سے نکل کر کلوک روم، گیلریوں اور پورچ کی سیڑھیوں پر اپنے اپنے دوستوں کے گروہوں میں شامل ہو کر موسیقی کی تنقید اور ادھر ادھر کی بے معنی، بیکار باتوں میں مصروف ہو گئے۔

”سیزن کا بہترین امیجیوریہ فورمینس!“

”جینٹ سمٹرن بالکل فلاح ہو گئیں اس مرتبہ۔“ آج پتا چلا کہ نشاط اور رفعت کتنی talented لڑکیاں ہیں۔“

”مسوری میں کچھ سال میں نے مارگریٹ جوردن کو یہی پارٹ کرتے دیکھا، کیا سٹریپ چیز تھی۔“ پھر دوستوں کے گروپ منتشر ہونے شروع ہوئے۔ نوٹین کلوک

دوم سے اوور کوٹ لیے ، میک اپ ٹھیک کرتی ہوئی نکلیں اور شب بخیر اور خدا حافظ کی مدہم آوازوں کے ساتھ کاریں اسٹارٹ کی جانے لگیں۔

اور اس وقت انور نے افروز کو دیکھا جو رفعت ، نشاط اور پیرکاش کے ساتھ گرین روم سے نکل کر بے حد تکلف سے اپنا اوور کوٹ سنبھالے اپنے بھائیوں سے نہایت مشغولیت سے باتیں کرتی پورچ کی مرمر سیڑھیوں سے اتر کے لمبی لمبی چمکیلی کاروں کی طویل فلیٹ کی طرف اپنی مورس میں بیٹھنے کے لیے جا رہی تھی۔ ”افوہ ! رنی دیکھا چاند کتنا اسمارٹ لگ رہا ہے۔“ لڑکیوں میں سے ایک نے چلتے چلتے کہا اور سب آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔ چاند یوکلپٹس کی ٹہنیوں میں سے نکل کر آسمان کی شفاف سطح پر تیر رہا تھا۔ ”خدا تم لڑکیوں سے ہر ذی ہوش جاندار کو محفوظ رکھے۔“ یہ نشاط کے بھائیوں میں سے ایک کی آواز تھی۔ اور پھر نشاط اسے پورچ کے ایک اونچے یونانی ستون کے پیچھے کھڑا دیکھ کر چپکے سے بولی: ”جناب بھی تشریف لائے تھے۔“

”جی ہاں۔ اور شاہد صاحب بھی۔“ رفعت نے کہا اور پھر ان کی کارز ناٹے کے ساتھ سامنے سے نکل گئی اور لا مارٹیز کے لڑکوں کی ایک ٹولی نے رقص گاہ سے نکلی کر سڑک پر جاتے ہوئے ”چپسی مون“ اونچے سروں میں شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترتا ہوا اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کار کی طرف بڑھا جو موٹروں کی شاندار فلیٹ کے آخری سرے پر درختوں کے اندھیرے میں کھڑی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا: ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ تم سوچتے ہو گیٹوں کی سرزمین میں رہنے والی وہ لڑکی جس کے باکوں میں سُرخ گلاب سجے ہوئے ہیں کبھی نہ کبھی تو تمہارے خوابوں کے دریچے کے نیچے سے گزرے گی اور تم اسے اپنے گناہ کا

نغمہ سنا سکو گے۔ اور سرج گلابوں میں رہنے والی لڑکی کہتی ہے کہ ایک روز وہ موسمِ گل کا شہزادہ اس کے خوابوں کے ایوانوں میں سے نکل کر آئے گا اور بس پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ٹریجیڈی دیکھیے وہ دونوں اس پگڈنڈی پر مل جاتے ہیں جو پریوں کی سرزمین کو جاتی ہے۔ لیکن ایک دوسرے کو دیکھیے بغیر بے پروا ہی اور بے نیازی سے گزرتے جاتے ہیں اور ادیرا ختم ہو جاتا ہے اور تماشائی اپنے اپنے صوفوں پر بیٹھے بیٹھے پہلو بدل کر رومالوں اور دستی پنکھیوں کی اوٹ میں سے اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں : ”کیوں — کیسی رہی ہے؟“

اور شاہد نے آگے بڑھ کر کہنا چاہا — کہتے جھوٹے ہو جھوٹی۔ تم سب شروع سے آخر تک ایک طویل مغالطے، ایک خوبصورت، دلچسپ فریب میں مبتلا رہنے کے اس قدر شوقین کیوں ہو؟ تمھارا ”لابوہیم“ کا ادیرا ”جیسی مون“ کے نغمے اور شویان کی موسیقی۔ تمھارے تلو تما کے تصورات، رفائیل اور لینارڈو کی تصویریں اور براؤننگ کی نظمیں۔ تمھاری بددماغ افروز سلطانہ اور تمھاری سپر اسٹار کچھیل اور مخدوم فسانہ نگار نشاط، منظر احمد اور اس کی اسپورٹس کار، پرکاش اور اس کی Mad-hatter's پارٹی، ادیناش اور اس کی فیشن ایبل cynicism — تم سب ان سب چیزوں، ان باری باتوں سمیت آج کی رات میرے جھوکارہنے کی وجہ ثابت نہیں کر سکتے۔ تم تو اس کا خیال بھی نہیں کر سکتے کہ تم جیسا انسان، جو تمھارے ساتھ ادیرا میں آسکتا ہے اور جس کے شہر کے سارے کافی ہاؤس اور سارے فرانسیسی اور اطالوی ریستوران کھلے ہوئے ہیں، بغیر کچھ کھائے پیے بھی زندہ رہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سلیمنگ کے لیے

نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میں تمہارے مٹر شویاں سے کھنا چاہتا ہوں: قبلہ! آپ کو اچھی طرح ڈنرا اڑانے کے بعد ہی یہ آسمانی نغے کمپوز کرنے کی سوجھتی ہوگی۔ آپ میری جگہ تشریف لے آئیے اور میں آپ کے پیا نو پر پہنچ کر ایسے ایسے نغے بنا سکتا ہوں جن کو سن کر دنیا آپ کے اور آپ کے سارے قبیلے والوں کے شاہکار، جو لوگوں کو اب تک احسن بناتے رہے ہیں، ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔ تمہارا جیسی مومن کم از کم میری آنکھیں تو ٹھیک نہیں کر سکتا۔ تمہاری عطربیز ہوائیں انڈین ریڈ اس کی اس خوبصورت ویلفیئر آفیسر تک میرا کوئی پیغام نہیں پہنچا سکتیں جو اس وقت قاہرہ میں زنجیوں کے ساتھ ایسی ہی فریب آلود خوش گوار باتیں کر کے انھیں اسی حماقت میں مبتلا کرنے کی کوشش میں مصروف ہوگی۔ وہ ویلفیئر آفیسر جو بچوں کی طرح لکڑی کے رنگین ٹکڑوں اور چمکیلی تصویروں کے ذریعے بہلا کر یہ بھلانے کی کوشش کرتی تھی کہ میری آنکھیں، جو خوبصورت کہلاتی تھیں، جو مومن کی گیس نے خراب کر دی ہیں اور مجھے دسپارچ کر دیا جائے گا اور مجھے کہیں نوکری نہ مل سکے گی۔ یقیناً تمہاری مونا لسا اور تمہارا دو پہلا چاند۔!!

اور چاند سیب کے اور چرڈ پر تیرتا ہوا اس کی بالکونی کے بالکل اوپر پہنچ گیا۔ وہ باہر نکل آئی اور ریلنگ پر جھک گئی۔ مسٹر لوائے نیکسٹ ڈور کا ڈرائنگ روم خاموش پڑا تھا اور کہیں مدھم سروں میں گتا رہ بجا یا جا رہا تھا اور اس نے کہا: اچھا — مسٹر لوائے نیکسٹ ڈور — تم اتنے خاموش کیوں ہو؟ تم اور تمہارا سیاہ آنکھوں والا دوست — ادھی رات کے چاند کی طرح زرد اور غمگین —

کیا تمہیں ہمسایوں کے اس چھوٹے بچے نے نہیں بتایا کہ دُنیا کتنی بوڑھی خلی ہے اور ایسی خوبصورت، شاداب اور لبّاش دُنیا میں غمگین رہنا جرم ہے اور مسرت کی صحت مندی کی توہین۔ کیا تم نے بھی تخیلی کردار بنائے ہیں؟ کیا تم کو بھی خواب دیکھنے آتے ہیں؟ جب روپہلا چاند سیب کے اور چرڈ پر جھللاتا ہے اور فضاؤں میں موزارٹ کے نغمے رقصاں ہوتے ہیں اس وقت میں تم سے چپکے سے پوچھنا چاہتی ہوں۔ کیا تم مجھے جانتے ہو؟ کیونکہ میں تم کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ جیسے ہم جنم جنم کے ایک دوسرے کے خاموش ساتھی ہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں لیکن کہہ نہیں سکتے۔ کیا تم بھی تنہا ہو۔ اتنی بڑی دُنیا اور دُنیا والوں میں گھرے ہوئے۔ لیکن بالکل تنہا! — اور نیچے پہلو کے باغ میں دوسائے آہستہ آہستہ ٹہل رہے تھے۔ اور ان میں سے ایک سایہ چاند کے مقابل میں کھڑا ہو کر کہنے لگا: خدا کی قسم، میرے دوست، تم جانتے ہو کہ یہ سب غلط ہے۔ یہاں سب جھوٹے ہیں لیکن پھر بھی تم بے وقوف بننے ہو۔ مجھ سے پوچھو، میں تمہیں بتاؤں گا کہ زندگی کیا چیز ہے۔ وہ سبز آنکھوں والی زرد رو جو لیٹ، جو نواب کے ساتھ فالنگ کرتی تھی اور جس نے ایک دفعہ میرے ساتھ بھی رقص کیا تھا اور مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں ہنزائٹس کا اے۔ ڈی۔ سی۔ بنا دیا جاؤں گا، وہ اب بھی کوک ٹیل پارٹیوں کے بعد ڈھولک کے ساتھ اُسی طرح گاتی ہے: 'میں نہ بولی چڑیا کو کاگ لیے جائے'۔ سب سنتے ہیں اور بے حد خوش ہوتے ہیں۔ تم نے اس لغویت، اس غلاظت پر غور کیا ہے؟ چڑیاں اور کوئے — چڑیاں اور

کوٹے یا تیلیاں اور بھنورے — زندگی کا یہ تعاقب — یہ دیوانگی — یہ جنون — مجھ سے میری بنتِ عم ، خوبصورت اور شیرِ رفعت ، نے کہا تھا: 'مائے شاہد بھائی، تم کتنے گڈو ہو۔ تم جنگ سے واپس آ جاؤ پھر بہت سارے پردِ گرام بنائیں گے۔' اور میں نے ، کتنا احمق تھا میں ، ان الفاظ کے سہارے پر کتنے خواب دیکھے۔ رفعت میرے ساتھ ہو گی اور زندگی کا خوش گوار اور پھولوں سے گھرا ہوا راستہ میرے سامنے۔ لیکن اس وقت میں یہاں ، اس اندھیرے میں ، اکیلا ہٹل رہا ہوں اور میرے ساتھ صرف رفعت کا ایک خط ہے جس میں اس نے لکھا ہے: 'مائے شاہد بھائی، کتنا افسوس ہے تمہاری آنکھیں خراب ہو گئیں۔ خدا کرے جلد بالکل اچھے ہو جاؤ۔ شام کو تمہارے اوپیرا میں ضرور آنا' اور بے وقوف تہرہ رومان کی ان ہی پیٹی ہوئی پگڈنڈیوں پر خوش خوش چل رہا ہے جن پر نہ درچاند بھللاتا ہے۔

اور نہ درچاند درختوں کے پیچھے چھپ گیا۔ اس نے کہا ٹھیک ہے بھائی، لیکن اس حماقت میں مبتلا ہو جانے کا احساس ہی کتنا پر لطف اور دلچسپ ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہنا چاہا ، سامن اسٹامٹائیز کی طرح جو اونچا ستون تم نے اپنے لیے منتخب کیا ہے اس کی بلندی پر سے ایک لمحے کے لیے نیچے اتر آؤ اور ان خود رو خوشبودار پھولوں کی جھاڑیوں کے پاس میرے پاس گھاس پر بیٹھو اور ہم محبت کے وہ گزرتے ہوئے رگیت سنیں جو وقت کی سنہری ریت کے اس پار پہنچ کر پھر کبھی واپس نہیں آتے۔ محبت کے وہ آسانی ، الوہی نغمے جو شوپاں ، مزارٹ اور ہینڈل نے ایسے ہی وقت میں ، انہی لمحوں کے لیے ،

تخلیق کیے تھے۔

اس روز سعیدہ کہہ رہی تھی: اور بھائی کتنا اچھا لگتا ہے کوئی ہم کو پسند کرے، ہم کسی کو پسند کریں۔ کوئی ہمیں چاہے۔ زندگی کے خالی، بے معنی اور بے رنگ نقوش میں اپنی چھوٹی چھوٹی شکستوں کے رنج، فتح مندوں کے غرور، اور تنہی مٹی مسرتوں کے اطمینان بخش احساسات سے دل کشی اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ یہ احمقانہ، طفلانہ خواہشیں — کوئی ہمیں چاہے!

— تم یہ کہتے ہو — تم جو سوسائٹی کی ساری ”مافی لائٹس“ کے پسندیدہ اور محبوب ہیرد ہو۔ نشاط جلیس مغرور لڑکی تمہارے ساتھ اچتی ہے۔ جلیس تم کو روزانہ فون کرتی ہے۔ اُجلا، جو کبھی کسی کو گانا نہیں سناتی، ریڈیو پر محض اس لیے گاتی ہے کہ تم سُنیو۔ اور چونکہ صرف ایک خود پسند لڑکی نے تمہارے سامنے جھکنے سے خاموشی سے انکار کر دیا ہے تو مرے جارہے ہو، احمق!

ہم سب احمق ہیں! اس نے کہا۔ اور گتار کی آواز مدھم ہوتی گئی اور کنواری لالت کا اندھیرا باغ پیر جھبک گیا۔

اور وہ بالکونی پر سے ہٹ کر اندر آ گئی۔ وہ اپنے بلند ستون پر سے نہیں اتر سکتی تھی۔ نہیں اترنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی شکست کے اعتراف کا خیال بھی نہیں کر سکتی۔ اس نے سرچا اور وہ پریوں کی سرزمین کو جانے والی دو متوازی پگڈنڈیوں پر تھوڑی دور تک اسی طرح چلتے رہے اور پھر یہ پگڈنڈیاں ایک دوسرے کو پار

کرتی ہوئی علیحدہ ہو گئیں۔

اور رفعت نے ایک روز خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا : افروز پیاری
ایک ٹریجیڈی ہو گئی۔ تم نے تو نوٹس کر دیا اور اس بیچارے نے اپنی شکستہ
دلی سے اکتا کر آخر شادی کی درخواست کر ہی دی۔ اور اب میں تمہارے اور حمی کے
ساتھ مسوری نہیں جاسکوں گی۔ ہم کشمیر جا رہے ہیں !

اور افروز کے خوابوں نے جس تخیلی کردار کو جنم دیا تھا وہ اسی کی حیثیت سے
اس کی زندگی میں تھوڑے سے وقفے کے لیے آیا اور اسی طرح نکل گیا۔ افروز کے لیے
وہ صرف مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور تھا، چاند کی وادی کا باسی۔ لیکن اب وہ
مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور نہیں رہا۔ رفعت کے نزدیک وہ محض انور تھا۔
سول سروس کا ایک اعلیٰ عہدیدار جو اگلے ماہ اس سے شادی کرنے والا تھا۔
کیونکہ رفعت، جس کے لیے زندگی ایک مسلسل جذباتی اضطراب تھی، اس کے
تعاقب میں کامیاب ہو چکی تھی۔

اور رفعت ماہِ غسل منانے کے لیے گلبرگ چلی گئی۔ افروز اپنے گھر والوں
کے ساتھ حسبِ معمول مسوری جا رہی تھی۔

نزد چاند بہت دیر تک اس کے ساتھ ساتھ چلنے کے بعد شوالاک کی
پہاڑیوں کی لیکر کے پیچھے جا چھپا اور دہرہ ایکسپریس کے اندھیرے کپاٹمنٹ
میں وہ اس ادھیڑ اور باتونی کرنی کی مسلسل آواز سے جاگ اٹھی جس نے
اپنا تعارف اپنے ہم سفر سے کرنل بھروچہ یا چٹہ یا مانڈویا اسی قسم کے
کسی خوبصورت سے نام سے کرایا تھا۔ وہ بے حد عمدہ اردو بول رہا تھا اور

اپنے خیال میں کوئی بہت ہی ضروری نکتہ بیان کر کے انتہائی جوش سے اور اچھے لہجے میں فارسی کا کوئی شعر پڑھ ڈالتا تھا۔ اس نے کھڑکیوں میں سے آتی ہوئی رات کی خنک ہواؤں سے بچنے کے لیے ساری کا آنچل چہرے پر ڈال لیا۔ وہ کہہ رہا تھا: ”استغفر اللہ! میں نے کہا، کیا قیامت ہے، مسلمان عورت کو شراب پلارہے ہو۔ قائد اعظم کے پان اسلامک نظام کے اخلاقی اور مذہبی ستونوں کا کیا حشر ہوگا۔ جواب ملا، بندہ نواز! این ہندوستان نیا شد۔ یہ جنگ کا زمانہ ہے اور یہ قاہرہ کی راتیں ہیں جہاں کی مسلمان عورتیں اپنی زندگی اور اخلاقی قدروں کو الزبتھ آرڈن اور میکس فیکٹر کے ڈبوں میں ایئر ٹائٹ کروا کے پیرس اور نیویارک سے منگواتی ہیں۔ اور پھر ہمارے رڑکے — میں کہتا ہوں عیش کر لینے دو۔ وہ رڑکے، جن کے باپ صرف ان کی ماؤں ہی پر اکتفا کر کے، ساقی سیمیں اور لب ہائے لعلیں کے شعر پڑھتے پڑھتے ختم ہو گئے — خوب پیتے ہیں — خوب ٹھاٹھ کرتے ہیں — بڑے بڑے شوہروں کی بیویاں اور اونچے اونچے باپوں کی بیٹیاں ان کے ساتھ قونصل خانے کے بال روم کی مرمریں ستونوں والی رقص گاہوں اور نیل کے رو پہلے ساحلوں پر ان کے ساتھ ناچتی ہیں اور ہمارے رڑکے سب کچھ بھول کر ان وقتی لہروں کے ریلے میں بہتے جا رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں اسے بیٹا، آج کل تمہارے تجربوں کے لیے اچھا زمانہ ہے۔ جنگ جاری ہے۔ رڑائی کے میدان سے اپنی میڈیسن اور سرجری کے ایسے ایسے نئے تجربے حاصل کر سکتے ہو جو پہلے کبھی نہ ملے تھے اور نہ اب آئندہ مل سکیں گے۔ پر انہیں

کچھ پروا نہیں۔ میں سوچتا ہوں : چلنے دو۔ سب ٹھیک ہے۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ اور پھر یہ لڑکیاں — جو آپ کے چیرامیوں کے پٹلوں کی طرح مکر کے گرد دوپٹوں کے کراس بنائے اٹھ سی پھرتی ہیں۔ یہ آندھی تو بھائی جان سب کو بہائے لیے جا رہی ہے۔ کہاں تک اس سے بچ پائو گے ؟“ اور اس کے ایک ساتھی نے کہنا چاہا : ”لیکن کرنل —“ سیکس —“ اور کرنل نے فوراً اس کی بات کاٹ دی۔ ”سیکس Sex be damned my dear Sir۔ یہاں جوابت ہے وہ ہے“ اسے گلاس کیس میں چھپا کر رکھ دینا کہاں کی عقل بازی ہے ؟“

”اُف — کیا لغویت ہے — اس نے سوچنا چاہا — کرنل اسی طرح باتیں کرتا رہا۔ رات کے خاموش اندھیرے میں پہیوں کے شور کی متوازن کیسانیت کرنل کی کوخت بھڑی آواز سے مل جل کر بڑا ناگوار سا اثر پیدا کر رہی تھی۔ یا اللہ ! زندگی کتنی ذلیل چیز ہے ! اور کرنل کی باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔

”مشرق وسطیٰ میں مقیم ہندوستانی فوجوں کو محفوظ کرنے کے لیے ہندوستان سے جو ڈانسنگ پارٹی گئی تھی اس میں لاہور کی ایک ہندوستانی عیسائی لڑکی ریجانہ بھی تھی۔“

”مجھ سے پوچھا گیا، کرنل صاحب، آپ خاص قسم کا پرائیویٹ پرفورمنس بھی پسند کریں گے ؟ میں نے کہا، بندہ نواز مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے ؟“

”ایں — کیوں ؟ ہی ہی ہی ہی۔ ریجانہ مجھ سے ملی تو کہنے لگی : کرنل صاحب آپ کے ہم نام ایک ڈاکٹر لاہور چھپاؤنی میں بھی ہوا کرتے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بیچارے۔ سنا ہے مر گئے۔ میری ماما ان کے ہسپتال میں نرس تھیں۔“

بہت تعریف کیا کرتی تھیں ان کی۔ پر میں تو بہت چھوٹی تھی جب۔ میں نے
 ہنس کر کہا: مکرہ! وہ تمہارے بڑے ہونے کا انتظار کرنے سے پہلے ہی کیسے
 مر سکتے تھے؟ ہی ہی ہی — کیوں؟ کیا خیال ہے تمہارا؟“

افروز نے پھر سونے کی کوشش کی۔ کرنل کہتا رہا: ”روسی چیف آف
 دی اسٹاف کے ساتھ کئی سالے والیاں بھی تھیں۔ امریکن قونصل کی لڑکی
 کہنے لگی: ”کرنل تم بہت فضول آدمی ہو، باتیں بہت کرتے ہو۔ پہلے
 ہمارے نکام کا علاج کر دو۔“

”میں نے کہا، فضول سہی، لیکن مکرہ، جب سر میں درد ہوتا ہے تو
 اہم ہی یاد آتے ہیں۔ وہ کہتی تھی کلکتے اور شملے میں میں تم ہندوستانیوں سے
 ملتے ہوئے ذرا بچکپاتی تھی۔ لیکن یہ قاہرہ ہے اور میاں کی راتیں بہت گرم
 ہوتی ہیں اور شرارت، کی خوشبوئیں بہت تیز۔“

اسما افروز کا آنچل اڑا رہی تھی۔ ٹرین چلتی رہی۔ کرنل کہہ رہا تھا: ”ابھی
 بیگمات اودھ نینی تال اور مسوری سے واپس نہیں آئی ہیں۔ ذرا بارشوں کے
 بعد لکھنؤ میں رونق آ جائے دو۔ خاکسار ایک کوک ٹیل پارٹی اور ایک ٹی
 ڈانس نہ چھوڑے گا۔ بھائی جان، خوب جانتا ہوں زندگی کا تعاقب کہاں تک
 کرنا چاہیے۔ میرا بڑا لڑکا بھی لفٹننٹ کرنل ہے اور اسے بھی معلوم ہے اور
 مجھے بھی کہ جہان تک اصولوں کا تعلق ہے، ہم دونوں اپنے اپنے راستوں
 پر اطمینان سے چل رہے ہیں اور ہمارے راستے کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں
 کاٹ سکتے۔“

اور ٹرین کی رفتار ایک اسٹیشن کے کمرے اور دھندلے میں داخل ہوتے ہوئے دھیمی ہو گئی اور وہ اپنے ہم سفرؤں کو خدا حافظ کہتا ہوا پلیٹ فارم پر اتر گیا۔ زندگی کے تعاقب میں، افروز نے سوچا۔ اور کرنل کے جانے کے بعد اس کا ایک دوست دوسرے دوست سے کہہ رہا تھا: ”کرنل کی باتیں سن کر تم نے خیال کیا ہوگا کہ یہ اعلیٰ درجے کا فنکار شخص ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کبھی جانی کہ اس سے زیادہ شریف اور پر خلوص آدمی دنیا میں ہی نہیں مل سکتا۔ اگر تم رات کے دو بجے اسے بلاؤ تو اپنا بیگ سمجھانے کے پاؤں کھانگتا ہوا پہنچ جائے گا۔ یہ جو کچھ کہتا یا ظاہر کرتا ہے محض اپنا اور دوسروں کا جی خوش کرنے کے لیے۔ بیوی مر چکی ہے، بڑا لڑکا بھی لفٹننٹ کرنل ہے اور ایک داماد آئی۔ سی۔ ایس۔ تین لڑکیاں انگلینڈ میں ہندوستانی فوجوں کے لیے کینٹین چلا رہی ہیں۔“

اور ٹرین چلنے لگی۔ کپارٹمنٹ میں پھر اذہرا ہو گیا۔ افروز نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور اسے منظرِ احمد یاد آ گیا جو مجلس سے شادی کر کے اپنی نئی اسپورٹس کار پر کشمیر جا کر ماہِ غسل منانے کے پروگرام بنانے میں مصروف تھا۔ اور اس وقت اس کو ایک بڑا پرستار، پرسکون سا احساس ہوا۔ اس کا ستون اب بھی سب سے علیحدہ اور سب سے بلند ہے۔ زندگی کی اس تنگ و دو، اس کشاکش سے بے نیاز اور بے تعلق زندگی کی یہ مسلسل چلو بکڑو، جانے نہ پائے، چرتیاں اور کوڑے، ”تتیاں اور بھونرے، ڈھوک پر جیسے پتنگ پیچھے دور کا قاتی ہوئی سبز آنکھوں والی جولیٹ اور اس کے پیچھے نواب، نشاط

اور اس کے افسانے، رفعت اور اس کے پیچھے دوڑتی ہوئی منظر احمد کی تیز رفتار اسپورٹس کار، روسی چیف آف دی اسٹاف کی سائے والیاں اور ان کے پیچھے ان کے زکام اور دردِ سر کا علاج کرتا ہوا دل شکستہ کرنل چٹّہ یا بھڑوچہ یا مانڈو جس کی بیوی مرچکی ہے اور جس کا بیٹا بھی لفٹننٹ کرنل ہے اور داماد آئی۔ سی۔ ایس۔ اور جو ناعاقبت اندیش، نا تجربہ کار نوجوان ڈاکڑوں کو مشورہ دیتا ہے کہ میٹر میں موقعہ ہے میڈیسن اور نرسری کے تجربوں کا، زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاؤ، نیل کے ساحلوں پر خوب ناچ لو، پھر کہاں یہ جنگ ہوگی، کہاں تم اور کہاں قاہرہ کی راتیں۔ دراصل وہ بہت اچھا آدمی ہے۔ یہاں سب بہت اچھے آدمی ہیں، ایک دوسرے کا خیال کرنے والے، ایک دوسرے کے تعاقب میں سرگرداں۔ سب اپنے اپنے محور پر تیزی سے گھوم رہے ہیں اور جو ان کی لپیٹ میں آجاتا ہے وہ بھی اسی تیزی سے گھومنے لگتا ہے اور اس بھاگتی ہوئی دنیا میں صلاح الدین محمود اور مسٹر بوائے نیکسٹ ڈور کے تخیلی کرداروں کی قطعی کوئی جگہ نہیں۔

اور پھر یک لخت اسے ایک بے حد عجیب خیال آیا : نہایت شدت سے اس کا جی چاہا کہ وہ کھڑکی میں سے پکار کر کہے : کرنل چٹّہ، ادھر آؤ، میری بات سنو، تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ میری بات سنو۔ جاؤ۔ خوب زور زور سے چلائے : کرنل چٹّہ، کرنل بھڑوچہ، کرنل مانڈو ! لیکن کرنل کب کا پلیٹ فارم کے دھندلکے میں کھو چکا تھا۔

اور مونا لسا کہ ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم بکھر گیا جیسے وہ یہ سب بہت پہلے سمجھ چکی ہے۔

جہاں کارواں بھیرا تھا

اس سنسان، اکیلی روش پر نرگس کی پتیوں کا سایہ جھک گیا۔ بیکراں رات کی خاموشی میں چھوٹے چھوٹے خداؤں کی سرکوشیاں منڈلا رہی تھیں۔ پیانو آہستہ آہستہ بجتا رہا اور اسے ایسا لگا جیسے ساری دنیا ساری کائنات ایک ذرے کے برابر بھی نہیں ہے اور اس وسیع خلا میں صرف اس کا خیال، اس کی یاد، اس کا تصور لرزاں ہے۔ اور اس وقت اس نے محسوس کیا کہ رات، مرغزاروں کی ہوا اور اس کی یاد ایک بار پھر جمع ہو گئے تھے۔ لیکن اسی وقت دھندلے ستاروں کی مدھم چیخیں آسمان پر گونج اٹھیں اور ان تینوں ساتھیوں کو منتشر کرتی ہوئی پہاڑیوں کی دوسری طرف جا کر ڈوب گئیں اور وہ خیالوں کے دھندلے میں سے کہتا سنائی دیا: لیڈی ویرونیکا۔ جی لیڈی می ہش۔ چاند من لے گا۔ پھول جاگ اٹھیں گے۔ اپنے سانہ اور رواں نہ کرو۔ نیندوں کی لہری کے راستوں پر سے خوابوں کا، پھولوں کا، گیتوں کا کارواں آہستہ آہستہ گزر رہا ہے اور اس نے انتہائی تکلیف کے ساتھ سوچا، اور ایسا سوچتے ہوئے اسے نامعلوم سی خوشی ہوئی کہ کاش، کاش وہ مر ہی جائے۔ وہ جس کی آواز

اب تک ستاروں کے دھندلکے میں گونج رہی تھی۔ وہ بس مر جائے۔ اگر وہ خود نہیں مر سکی تو وہ کیوں نہیں مرتا۔ لیکن وہ زندہ ہے۔ سب زندہ ہیں۔ اور چاند اُلوچے کی ٹہنیوں کے پیچھے چھپ گیا اور چاندنی رات کا گیت ختم کیا۔ مہاگنی کے بھاری سیاہ آتش دان کے کونے پر چلتی ہوئی شمع لڑنا اٹھی اور تصویر کے برٹے سے شیشے کی سطح پر دھندلی زرد روشنی کی لکیریں تیرتی رہیں اور نیلیگوں رات کے ایوانوں میں سے جھک کر چھوٹے چھوٹے خداؤں نے چپکے سے اس سے کہا: لیڈی ویرونیکا، ہوائیں خاموش ہیں، پھول سوچکے ہیں۔ تمہاری تصویر کی بڑی بڑی نیلی آنکھوں کے اوپر کے شیشے کو گردنے دھندلا کر دیا ہے اور اس پر پرانے نقرئی شمع دان کا اجالا جھللا رہا ہے کیونکہ تم لیڈی ویرونیکا نہیں ہو اور نہ زندگی وہ زندگی ہے جس میں چاند کی روشنی ہتھوپاں کی موسیقی، مچھلوں کے رنگ اور سمندر کی موجیں نکھیں۔ خوبصورت زندگی، خوبصورت دنیا

اور خوبصورت لیڈی ویرونیکا — Oh ! you silly little Lady. make

believe - شمع کا دھواں دیوار پر لہرا رہا ہے اور مہاگنی کا سیاہ آتش دان زیادہ

مہیب نظر آ رہا ہے۔ زندگی مہیب ہے۔ ہیبت ناک، خوفناک اور اگتا کی ہوئی۔

زندگی اپنے آپ سے اگتا گئی ہے۔ زندگی کبھی ہاتھ نہ آنے والی اور دور سے نظر آ کر چھ کھوجانے والی فردوس کے لیے روتے روتے تھک چکی ہے۔

اور اس اندھیری روش پر سے آدھی رات کی ہوائیں شور کرتی ہوئی گزرتی

ہیں۔ اس نے پیاؤ بند کر دیا اور اسے خیال آیا کسی نے کہا ہے: ”خدا نے ہمیں یادوں کا قیمتی خزانہ اس لیے عطا کیا ہے کہ ہم سہرا کی ہر فانی فضاؤں میں بہا رہے

کے گلاب کی گرم خوشبو میں حاصل کر سکیں۔“ اف یہ یادیں۔ اس نے محسوس کیا کہ یادوں کا اس فراوانی نے اسے تھکا دیا ہے۔ پھر بھی وہ یادیں اور احمقانہ خواہشیں آگ کی سی تیزی کے ساتھ جل رہی ہیں اور ہوا کے ایک تیز جھرنکے سے لیڈی ویبرینکا کی تصویر کے نیچے لڑاں شمع یک لخت بھڑک کر بجھ گئی اور موسیقی کی کتاب کے چند ورق منتشر ہو کر سیانہ سے نیچے گر پڑے۔ قریب کی کوکھٹی میں کسی نے ریڈیو گرام پر ایک پرلے نغے کا ریکارڈ بجانا شروع کر دیا تھا: ”میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مر میں ایوانوں میں رہتی ہوں اور ان محلات کی چار دیواری کے باسی مجھ پر نازاں ہیں اور میں ان کی امیدوں کا سہارا ہوں۔ میرے پاس بے شمار دولت ہے اور میں بے انتہا اعلیٰ نسب ہوں، اور خواب میں میں نے یہ بھی دیکھا، جس سے مجھ میں بخیر خوشی ہوئی، کہ تم اب بھی مجھے اتنا ہی چاہتے ہو۔“ ایک مرتبہ کالج کے اوپیرامیں اس نے یہ گیت اس اسٹریٹ ڈیوٹ کی ٹرک کی کارپارٹ ادا کرتے ہوئے، جسے بچپن میں خانہ بدوش چھڑالائے تھے، پائمن کے جنگلوں میں پناہ گزین پولش فوجی افسر کو سنایا تھا۔ شاید ایڈوینا نے بھی، جو اوپیرامیں ہیرو بنی تھی، اب تک یہ گیت فراموش کر دیا تھا۔ ہم سب یہ گیت بھول چکے تھے۔ میں اور کملا اور ویدا اور ہر جیبن۔ ایسے بیکار کے جذباتی نغموں کا اثر کون لیتا ہے اور کون یاد رکھتا ہے؟ اور اس نے بہت شدت اور تکلیف کے ساتھ سوچا، کاش تم نے اس دتت جھے چاہا ہو تا جب میں نے بھی تمہیں چاہا تھا۔ لیکن خداؤں نے ایسا نہ ہونے دیا کیونکہ پھر وہ یقیناً مر جاتی۔ اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اکیلی ہے اور اس سے

بہت دُور ہے اور وقت کسی پرلنے دیتا کا پُرا نا خواب بن کر اپنی جگہ پر بٹھ گیا ہے وہاں پر صرف رات کی چیخیں تھیں اور خوابیدہ کائنات کی سکیاں اور چاندنی کی ٹھنڈی آگ۔

وہ ریلنگ کے سہارے برآمدے کے ٹھنڈے فرش پر لیٹی تھی اور اسے ایسا لگا جیسے اس کے چاروں طرف شبنمی راہیں پھیلی ہوئی تھیں اور ان راہوں کے کنارے ان راستوں کی منزلوں پر ہم سب وہاں موجود تھے، اس کے منظر تھے لیکن وہ ہم کو پیچھے چھوڑ آئی تھیں۔

اور پھر یہ سب کچھ سوچتے سوچتے نیلو فرسوگئی اور فضاؤں میں ہوا کے راگ اور خداؤں کی سرگوشیاں بند ہو گئیں۔

کس قدر جلد یہ سب مذاق ختم ہو گئے۔ ایک تصویر کو آخری سچ دیتے ہوئے مجھے خیال آیا۔ زندگی کا نیا چاند تہقہوں، آنسوؤں اور خوابوں کی حدوں سے دُور، شفق کے جزیروں پر کبھی طلوع نہیں ہوتا اور ہم اس کے انتظار میں تھک کر سو جاتے ہیں اور پھر رات آتی ہے اور رات کی خاموشی اور پھر موت — عشق کی موت۔ لیکن پھر بھی ہم زندگی کو دلچسپ اور زندہ رہنے کے قابل سمجھنے کے لیے مجبور ہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں، دیو پرٹ بروک کی نظمیں، نہارا اشترین طرز کی کلاسیکل موسیقی، والز کے نغمے، جیمس میسن کے فلم — یہ توٹی چھوٹی احمق چیزیں — زندہ رہنے کی یہ بے وقوفی — زندگی سب ہی مضحکہ خیز چیز ہے — ہے نا! اس میں کوئی پلاٹ نہیں، کوئی ٹیگ نہیں۔ بہت سی باتیں ہیں۔ ایک کے بعد ایک، نگاتا رہس ہوتی چلی جاتی ہیں جن کا آپس میں کوئی منطقی ربط

تلاش نہیں کیا جاسکتا، جن کا پہلے سے کچھ پتہ نہیں ہوتا اور نہ بعد میں پتا چلتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ جی ہاں، زندگی بہت ہی مضحکہ خیز چیز ہے اور اس وقت چائنا پیلیٹ میں رنگوں کو ملائے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ میری اور کسلا کی ساری منطق اور فلسفہ طراناں یہاں پہنچ کر بالکل ناکامیاب ثابت ہوئیں۔

کیونکہ مہار کی ایک نارنجی سہ پہر کو کلچ کے سوئمنگ پول کے مرمرین فرش پر کھینچوں کے بل لیٹے لیٹے ہم نے اچانک یہ محسوس کیا کہ نیلو فر کی نیلی آنکھوں میں اُداسی کی لہریں تیرنے لگی ہیں اور انکو کمسن پڑھنے کی کوشش ملتوی کر کے چاروں طرف جھکے ہوئے اُم کے درختوں کے پرے دیکھتے ہوئے ڈورس نے دفعۃً ایک سوال کیا: ”اس کو دیکھا؟“

”ہوں!“

مب نے ایک ساتھ جواب دیا، پھر خاموشی چھا گئی: ”واش آؤٹ ہے بالکل۔“ نیلو فر نے بے تعلقی سے رائے ظاہر کی۔ ”ایسی کے سامنے کچھ مت کہو۔ اس کو اپنے اس بھائی پر بہت فخر ہے۔“ سعیدہ نے کہا۔ ”خیر بھائی وہ ہرگز نہیں بگڑے گی۔ واش آؤٹ تو وہ بالکل نہیں ہے۔ مگر جناب وہ اپنے بھائیوں کا پروپیگنڈا قطعی نہیں کرتی ہے۔ بلکہ اس نے تو بہت اُنکساری اور خاکساری سے اور بالکل یونہی تذکرہ کیا تھا کہ اور تو اور زبیدہ عثمانی تک اس کے تازہ وارد بھائی سے فلرٹ کرنے کی فکر میں ہیں۔“ ڈورس آہنی میسرے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

— اور اسی طرح دیر تک ان نئے انکشافات کے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔

اور جب پھولوں کا موسم گزر کر نیلے بادلوں اور پھولوں کا زمانہ آیا، جب

دوپہر اور سہ پہر کے وقت قبوہ خاؤں میں انتہائی چہل پہل اور رونق ہوتی ہے، تو کالج میں اچھا خاصا سنسنی خیز تہلکہ مچ گیا! ”فرخندہ آج بھی وہ قبوہ خانہ میں سخت show off کر رہا تھا اور اکثر سیاہ جینز لگا رہا ہے چمکد کہیں کا کیونکہ سیاہ جینز سے زیادہ خوبصورت نظر آیا جاسکتا ہے اور ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ بال کے بیچ کی نشستوں پر بیٹھ کر گولڈن کے ذریعے آپ سب کو اچھی طرح دیکھ سکتے ہیں لیکن یہ کس کو نہیں معلوم ہو سکتا کہ آپ کی فطری کس کس طرف ہیں۔ مگر جی بے حد شاندار ہے اور اتنا کس قدر ہے۔ آخر ہے کون یہ؟“ اور میں نے شرارتاً بونہی بے خیالی میں کہہ دیا: ”وہ ہے — وہ ہے — نیلو فر کا بیٹا ہے۔“ اور سارے کالج میں جلنے کس طرح آپ سے آپ یہ خبر مشہور ہو گئی کہ نیلو فر کی شادی امتحانات کے فوراً بعد ہو جائے گی اور اس کا بیٹا آج کل لکھنؤ میں ہے۔ اور جانے کس طرح نیلو فر نے یہ سوچ لیا — جانے کیا کیا سوچ لیا۔ اور سعید دھنلے کہا: ”بھئی نیلو فر اپنی ساری اٹیٹیوڈ تہہ کر کے رکھ دو۔ بہترین پینک ہے۔ خوبصورت، دلکش اور اعلیٰ ائمہ سے پر، اور تمھاری ہی دوست کا کزن بھی ہے۔“ نیلو فر نے ایک دفعہ کہا تھا کہ وہ بچپن میں پورٹ بلیئر میں ہم لوگوں کے ساتھ رہ چکا ہے۔ میں نے اور کملانے دماغ پر بہت زور ڈالا لیکن قطعی یاد نہیں آیا اور پھر ڈورس نے کہا کہ بھئی وہ تمھارے بچپن کے جلنے والے بھئی نکل آئے Go ahead sister۔ وہ اپنے مخصوص انگریز انداز میں بولی اور نیلو فر فوراً اوپر پڑنے پر آمادہ ہو گئی۔ ”بچپن کے جاننے والے کیا تمھارے نہیں ہیں۔ اپنی کے تو کزن ہیں۔“

”ہوں گے بھئی، ہم کو تو بالکل یاد نہیں۔ پورٹ بلیئر کا زمانہ گزرے اتنا

عرصہ ہو گیا۔ اگر ہمیں پہلے نہ معلوم ہوتا کہ تم کنیرڈ سے آئی۔ ٹی۔ آر ہی ہو تو، ہم تم کو بھی نہ پہچان سکتے۔“ و ملانے کہا۔

اور ہمارے ٹیلی فون کی گھنٹیاں زیادہ تیزی سے بجنے لگیں۔ جب تک مسعود بھیا کو الگ کوٹھی نہیں ملی وہ ہمارے یہاں ہی رہے اور ہماری ایک دوست کی دوست زبیدہ عثمانی نے، جو ایم۔ اے۔ اور لاء کے امتحان دیا کرتی تھی، اب براہ راست میری دوست بن جانا از حد مناسب سمجھا۔ وہ دو دن میں آٹھ بار فون کرتیں۔ نوکروں سے کہہ دیا گیا تھا کہ جب ان کا فون آئے تو کہہ دینا کوئی گھر پر نہیں ہے۔

اور اس شام نیلوفر قانون کی کلاس کے بعد ہوسٹل جانے کے بجائے سیدھی ہمارے یہاں آگئی۔ لان پر درختوں کے اندھیرے میں سب گھر والے جمع تھے۔ اس نے پچھانک سے ہی دیکھ لیا کہ ایک شان دار نیلی اسپورٹس کار برساتی میں کھڑی ہے۔ میرے پرہیزگار سر کے درختوں سے پھٹنی ہوئی روشنی میں اس نے غور سے دیکھا کہ سوائے کنور ہند ر سنگھ اور ایک اور صاحب کے باہر کا آدمی کوئی نہ تھا۔ اس نے سوچا شاید کنور صاحب نے اپنی کار تبدیل کر لی ہے۔ وکیل صاحب آگے بڑھی۔ نیلوفر تھکی تھکا کانی ٹمی کے قریب آرام کو کسی پر بیٹھ گئی۔ ہلو وکیل صاحب۔ کنور ہند ر نے دوبارہ کہا۔ ”اوہ آپ کب آئے ہند بھائی۔ نیلوفر نے چونک کر کہا۔ شکریہ میرے صاحب کو یاد تو آیا کہ اس خاکسار کو ہند کہتے ہیں۔ اور میں مسعود جاوید ہوں۔ ہند کے ساتھ تھے کھڑے ہو کر اس ذوق اور خود اعتمادی کے ساتھ اپنا تعارف کرایا جیسے دنیا میں صرف ایک وہی مسعود جاوید ہو سکتے ہیں، کوئی بہت

اسی اہم اور مشہور سہتی۔ نیلو فرنے بیزارمی کے ساتھ سوچنے کی کوشش کی۔ ہونہ
 — اتر اٹھ کی انتہا — رات کا وقت ہے ورنہ گوگلز اس وقت بھی موجود ہوتے۔
 کھانے کا انتظام کروا کے تھوڑی دیر بعد میں باہر آ گئی۔ بھائی جان بھی شام کی شفٹ
 ختم کر کے دفتر سے واپس آ گئے تھے۔ چاند سرو کے درختوں کے پیچھے سے طلوع ہو چکا
 تھا۔ کھانے کے وقت تک کے لیے ہم سب مس شانی کے فون کی باتیں کرتے ہوئے باہر
 خاموش سڑک پر ٹہلنے لگے۔ کنور مہندر نے کہا: مسعود کو اب تک لکھنؤ کی تاریخی
 عمارتوں کی سیر نہیں کرائی دگئی۔ اگر اگلے صبح اس کا یہاں سے بھی تبادلہ ہو گیا تو وہ
 کچھ نہیں دیکھ پائے گا۔

میں نے بے حد سنجیدگی سے انھیں بتایا لکھنؤ کے سب سے زیادہ تاریخی اور
 اہم ترین مقامات صرف تین ہیں: ۱) فیض آباد روڈ، ۲) فیض آباد روڈ، جہاں
 کھانا ہوتا ہے، اور ہمارے کالج کالیڈی جہاں راج سنگھ سوئمنگ پول جس کی خشک
 تہ میں جمع ہو کر ہمارے اسکینڈل کلب کی میٹنگ ہوتی ہے۔ اتنے میں گومتی کے قریب
 والی سڑک پر سے انوری بیگم اور قمر الاسلام آتے دکھائی دیے۔ دیکھو مسعود بھتیجا
 اسے مون لائٹ سیریفیڈ کہتے ہیں، میں نے ایک مستعد گائیڈ کی طرح سمجھا یا۔ کنور
 مہندر، بھائی جان اور مسعود بھتیجا نے اپنی خوبصورت یونانی قسم کی ناکیں سکیرٹ
 کر گویا کچھ سونگھنے کی کوشش کی۔ مسعود بھتیجا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا: اور
 تمہارے یہاں ڈونکی سیریفیڈ کیسا ہوتا ہے؟ بڑا زبردست تہقہہ پڑا۔ ہم
 ٹہلے ہوئے ٹریلوے کو اسنگ تک چلے گئے۔ وہاں تاروں پر بیٹھے ہوئے مسعود
 بھتیجا کو دفعۃً جیسے کچھ یاد آ گیا ہو اور انہوں نے آہستہ سے کہا: لیڈی ویرونی

نیلوفر چٹنگ پٹری اور کپڑے سب کو دور، ریلوے لائن کے اس پار، گئے کے کھیتوں کے اوپر جھکے ہوئے چاند کے اُجالے میں یاد آیا۔ پورٹ بلیئر میں ایک بارہ ملا کی سالگرہ کے فینسی ڈریس بال روم میں نیلو فراٹھارویں صدی کی ایک مغربی شہزادی بنی تھی — لیڈی ویرونیکا — سی لیڈی اور ڈھیروں جھالروں اور رہنوں والے وزنی لباس میں چھپی ہوئی چھوٹی سی لیڈی ویرونیکا نے اپنی بڑی بڑی نیلی آنکھیں جھپکا کر شامانہ وقار سے اپنی پنکھیا بلائے ہوئے کہا تھا: لاموسیو! مجھے ماری انطونی کہو۔ اور مسعودھیانے دورانو جھک کر اس کے حکم کی تعمیل کی تھی اور نیلو فر نے اپنی عجیب مضحکہ خیز حماقت آفرین ٹوپی کا پتہ چھوٹے ہوئے کہا تھا: ارے میرے ڈارلنگ لوٹی — میرا بھیڑ کا سفید بچہ تم نے اب تک پیرس سے نہیں منگوایا۔ اور اچھا بھئی اب تم جیسے ایک بیوقوف سے سویڈش کاؤنٹ ہو، اب تم جھک کر پہلاتے ہوئے کہو۔ یور۔ یور میجسٹی — آپ دنیا کی خوبصورت ترین ملکہ ہیں۔

— اور اس وقت چاند کے مدھم اُجالے میں ہمیں جزائر انڈیمان میں گزارا ہوا اپنا بچپن یاد آگیا۔ جزیرے میں جو کوئی افسر سمندر پار سے تبدیل ہو کر آتا، ہم سب سے پہلے یہ کھوج لگاتے کہ اس کے ساتھ بچے ہیں یا نہیں۔ مسٹر جیپال کے بچے، ہم بہن بھائی، نیلو فر اور اس کی دونوں بڑی بہنیں اور چیف کمشنر کی لڑکی ایڑھی — سارے جزیرے میں صرف اتنے بچے تھے۔ ہم صبح سے شام تک لھیلے اور لڑتے۔ سہ پہر کو ساحل پر جا کر سیپیاں جمع کرتے، ریت کے قلعے بناتے، یڑھی کی قیادت میں کنارے کنارے تیرنے کی مشق کرتے اور رات کو بیٹھ کر جیو میٹر

اور گرامر میں سرکھپاتے۔ بھائی تاجان، کھلا اور ملا کے بڑے بھائی، ہم سب میں بلندو بالا اور قابلِ قدر مستیاں سمجھی جاتیں کیونکہ دونوں ہم سے دور، سمندر پار، کرنل براؤن سٹریٹ میں پڑھ رہے تھے۔ کرسمس اور گرمیوں کی چھٹیوں میں جب یہ دونوں ہندوستان سے پورٹ بلیئر آتے تو ہم سب کو کس قدر خوشی ہوتی تھی۔ ہم سب کی کوٹھیاں پاس پاس تھیں۔ لکڑی کے دو منزلہ جاپانی وضع کے سرخ چھتوں اور سبز جنگلوں والے ہمارے پیارے پیارے سے گھر۔ نجلی منزل میں ہماری کوٹھی کی حفاظت کے لیے گارڈ کے سپاہی رہتے تھے۔ برساتی کے اوپر سمندر کے رخ پر بڑے بڑے شیشے کے دریچوں والا ڈرائنگ روم تھا جہاں سے بندرگاہ کی طرف آتے ہوئے جہاز نظر آتے رہتے تھے۔ رات کو افق کی سیاہ لکیر کے قریب لائٹ ہاؤس کی روشنی جھللاتی تھی۔ وہاں رنگوں کی کس قدر فراوانی تھی۔ گہرائیلا اور گہرا سبز سمندر، سنہری ریت، سرمئی چٹانیں، کوٹھیوں کی سرخ چھتیں، ناریل کے ہرے جھنڈ، ساحل پر لہریں مارتی ہوئی نارنجی دھوپ، سفید سمندری پرندے اور ہماری کشتیوں کے سفید بادبان — چاروں طرف رنگ ہی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ کاش میں برسی ہوتی تو ان رنگوں کو سمیٹ کر کینوس پر بکھیر دیتی۔ حدِ نظر تک پھیلے ہوئے لالہ ناروں پر برسی ہوئی دھوپ میں ایسا لگتا تھا جیسے فضا میں آگ لگ گئی ہے اور رنگ برنگے شعلے لپک رہے ہیں۔ ہمارے باغ کی ڈھلوان کے اختتام پر ناریل کے جھنڈ میں چھپی ہوئی مسٹر جیپال کی کوٹھی تھی۔ جب ابا جان اور انکل جیپال اپنے دفاتروں کو چلے جاتے اور ہمیں بادلِ ناخواستہ اپنے اپنے گھروں میں ماسٹروں سے پڑھنا پڑتا تو وقت ٹیلی فون کی شامت آجاتی۔

و ملا فون کرتی: امی تمہارے ٹیڈی بے کی طبیعت اب کیسی ہے؟ میری پوسو

کو زکام ہو گیا ہے اور شکستہ لگنے میرے اسکوٹر کے پیسے تو پڑ ڈالے ہیں۔ تمہارے مولیٰ صاحب اب تک نہیں سوئے۔

سہ پہر تک یہی ہوتا رہتا تو قینکے مہی کی ڈانٹ نہ پڑ جاتی یا مولیٰ صاحب اس شور سے گھبرا کر اپنے مرلقے سے نہ چونک اٹھتے۔ ہمیں اردو بالکل نہیں آتی تھی۔ آبا جان کو سخت پریشانی تھی کہ اگر مہی عالم رہا تو بچے بالکل اینگلو انڈین بن کر رہ جائیں گے۔

چنانچہ بے حد انتظام سے کلاس سے ایک سرخ داڑھی والے مولیٰ صاحب کو پکڑ کر منگوایا گیا تھا اور الٹی میٹم ملا تھا کہ اگر تم نے مولیٰ صاحب کے ساتھ بھی شرارت کی تو یاد کرو کان پکڑ علی گڑھ بھیج دیا جائے گا۔ یہ بات اس قدر خوفناک معلوم ہوئی تھی کہ دل پر جبر کر کے ہم نے اردو کی گرائمر اور آئین نامہ یاد کرنا شروع کر دیا تھا۔ تجھے اب تک اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز مولیٰ صاحب پہلی مرتبہ آئے تو انہوں نے قرآن شریف شروع کر دینے سے پہلے بے حد سنجیدگی سے پوچھا: بی بی تم ہاتھ کھول کر نماز پڑھتی ہو یا ہاتھ باندھ کر۔ ہم نے بتایا کہ ہم نماز ہی نہیں پڑھتے۔ اتنے چھوٹے سے تو میں، کیسے پڑھیں۔ پھر انہوں نے پوچھا: اچھا تمہاری مہی کس طرح پڑھتی ہیں۔ جواب ملا معلوم نہیں۔

انہوں نے پریشان ہو کر آبا جان سے اس مسئلے پر رجوع کیا۔ روزانہ ہمیں آٹھ بجے ہی سوئے کو بھیج دیا جاتا لیکن ہفتے اور اتوار کی رات ہمارے لیے گالاٹ ہوتی تھی کیونکہ اس روز ہم سب کے احمی اور آبا جزیئرہ نکو بار کے کلب سے بہت رات گئے واپس آتے۔ ان کی غیر موجودگی میں بچوں کی حفاظت کے لیے گارڈ دہری کر دی جاتی تھی اور ہم سب کو جمع کر کے شکستہ یا ایڑھی کے سپرد کر دیا جاتا تھا۔ ہم لوگ

جی بھر کے شور مچاتے۔ اندھیرے کمروں، گیلریوں اور زینوں میں چھپ کر ابکھنچولی کھیلے۔ اس قدر زور زور سے گاتے کہ بیانو کے پردے ٹوٹتے ٹوٹتے رہ جاتے۔

اور پھر ایک روز ہم نے سنا کہ ہماری اس جنت میں ایک اور فرشتے یا شیطان کا اضافہ ہونے والا ہے۔ میں باغ کی سیڑھیوں پر بیٹھی فریج گرامر یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ نیلو فریج بھاگی آئی اور اپنی نیلی آنکھیں پوری طرح کھول کر بولی: اپنی راج صبح جو بہت لمبا سا سفید جہاز سنگاپور سے آیا ہے اس میں سے ایک کرنل صاحب اترے ہیں۔ ان کی بیوی انگریز ہیں اور دو بچے ہیں۔ اور وہ سب اس وقت انکل جیپال کے یہاں چائے پی رہے ہیں۔ میں نے کتاب وہیں سیڑھیوں پر چھوڑ دی اور ہم دونوں باغ کے نشیب کا فاصلہ پھلانگتے ہوئے انکل جیپال کے یہاں پہنچے۔ ہمیں آتا دیکھ کر کھلا اسی رفتار سے دوڑتی ہوئی برآمدے کے سبز جنگلے پر سے کود کر ہماری طرف بھاگی۔ ہمارے دو ساتھی اور آگئے۔ دونوں پوری طرح شیطان ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں کہ اسکیٹنگ اور تیرنے کے مقابلے میں وہ ہم کو ہرا دیں گے۔

لیکن کتا۔ ان کے ڈیڈی بھی دم والا کوٹ پہنتے ہیں نا۔ میں نے کچھ سوچ کر پوچھا کیونکہ آبا جان شام کے وقت دم والا سیاہ کوٹ پہن کر اپنی موٹر بوٹ میں بیٹھ کے نکو بار کے جزیرے کی طرف جایا کرتے تھے جہاں کلب تھا جس میں ہر وقت موسیقی گونجتی رہتی تھی اور جہاں رات گئے ٹیمک خوب تیز روشنی رہتی تھی اور میرا خیال تھا کہ دنیا میں صرف دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں: وہ جو شام کو دم والا کوٹ پہنتے ہیں جیسے انگریز چیف کمشنر، آبا جان اور انکل جیپال اور نیلو فر کے ڈیڈی اور دوسرے وہ جو دم والا کوٹ نہیں پہنتے۔ کیوں نہیں پہنتے؟ یہ سوال میرے

دماغ میں نہیں آسکا تھا اور نہ یہ کہ ان دوسرے قسم کے لوگوں کے بچوں کے ساتھ کھیلنے کی ہمیں اجازت کیوں نہیں ملتی۔

اور ان دونوں بچوں کی وجہ سے ہماری زندگی زیادہ دلچسپ بن گئی۔ حمی کے بہن بھائیوں کی قوم سارے ہندوستان میں پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں بھائی بھی کسی رشتے سے باہل ہمارے فرسٹ یا سیکنڈ کزن ثابت ہو گئے۔ ان کی حمی یعنی ہماری خالہ کا انتقال ہو چکا ہے اور ان کے ڈیڈی نے ایک انگریز خاتون سے شادی کر لی تھی۔ اور چونکہ وہ حمی کے بھانجے تھے لہذا وہ ان کی نگہداشت اور خاطر و ارات کی خود ہی انجام دہی مقرر ہو گئیں۔ وہ جتنی بھی شرا تیں کریں اور ہمیں تنگ کر میں سب بجا اور روا تھا کیونکہ دکھیا، بن ماں کے نیچے ہیں۔ مسعود بھیا ہم سب اور ہمارے سمندر پار والے بھائیوں سے بھی عمر میں بڑے تھے۔ بیک وقت بے حد سنجیدہ اور بے حد شیریں۔ ہر بات میں ہم سب کو بولکس کرتے تھے اور ہم اپنی عافیت اسی میں سمجھتے تھے کہ ان کا ہر حکم چپکے سے مان لیں۔ ایک روز مسعود بھیا کی شرا توں سے عاجز آکر ملا اور میں نے آنکھوں میں آنسو بھر کے دعا مانگی تھی کہ اللہ کرے بھیا جلدی سے دہرہ دون سے آجائیں۔ وہ آکے سارے مظالم کا انتقام لیں گے۔ لیکن بد قسمتی سے اگلی چھٹیوں میں ہمارے بھائیوں میں جہاز سے اترتے ہی مسعود بھیا سے اس قدر گہری دوستی ہو گئی کہ ہمیں بھی انتقام سے نا امید ہونا پڑا۔

اور اس طوفانی بچپن کے دن تیزی سے پروانہ کرتے رہے۔ چند سال بعد ابا جان اور انکل جیپال کا تبادلہ ساتھ ساتھ پھر ہندوستان کا ہو گیا۔ ایزمی ہمارے آنے کے کچھ عرصے بعد انگلستان واپس چلی گئی۔ مسعود بھیا بھی جانے کہاں گئے

اور بچاری نیلو فریئر سے میں اکیلی رہ گئی۔

پورٹ بیئر سے آنے کے بعد ہم ان سب کو بھول گئے۔ ہندوستان واپس آکر شکنتلا، کملا، دولا اور میں دہرہ دون کے کانونٹ میں پڑھنے لگے۔ پھر ریشاٹر ہونے کے بعد اباجان ہماری اعلیٰ تعلیم کے خیال سے لکھنؤ میں رہنے لگے۔ اسی دوران میں انکل جب پال کا تبادلہ الہ آباد سے لکھنؤ کا ہو گیا اور ہم سب ساتھ ساتھ کالج اور یونیورسٹی کی مختلف کلاسوں میں داخل ہوئے اور بڑے ہو کر تو ہم سب اس قدر تیز نکلے کہ خدا کی پناہ۔ شکنتلا اور کملا بی۔ اے۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی۔ سب امتحانوں میں فرسٹ آتی چلی گئیں۔ تقریری مقابلوں میں ڈھیروں کپ جیت ڈالے۔ کملا اور دولا نے اورے شنکر کے ویاں جا کر کلاسیکل رقص میں مہارت حاصل کر لی۔ کملا انٹروورسٹی تقریری مقابلے میں علی گڑھ جا کر ایک بڑی سی چاندی کی مسبی اٹھا لائی اور میں نے تصویروں کے کیئوس تہہ کر کے افسانے جو لکھنے شروع کیے تو سب گھروالوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ افوہ، ذرا سوچو تو سہی، بی بی گھر سے باہر کی دنیا میں افسانہ نگار مشہور ہیں۔ اور کھانے کی میز پر اس قدر شور مچتا — میں بچاری سب سے لڑتی کہ بھائی قسم خدا کی میں اتنے اچھے افسانے لکھتی ہوں۔ ابھی یہ دیکھیے ”ادب لطیف“ اور ”ساقی“ کے ایڈیٹروں کے خط آئے ہیں کہ سالانہ کے لیے مضمون بھیجیے۔ اور وہ قہقہہ پڑتا کہ رونا آجاتا۔

ایک روز میں نے بے حد خوش ہو کر چلے کے وقت سب کو یہ خبر سنائی کہ بھئی ہمارا مجموعہ شایع ہو رہا ہے۔ کسی کو یقین ہی نہ آئے۔ بھائی جان کے ایک دوست نے انتہائی سنجیدگی سے فرمایا کہ کتاب کے ساتھ ساتھ ایک شرح بھی چھپو ایسی تاکہ پڑھنے والوں کی سمجھ میں

آجائے کہ آپ نے کیا لکھا ہے۔

قصہ تحقیر یہ کہ ہم سب اس قدر اٹلکچر ٹیل بن گئے کہ افوہ - ہمارا اپنا فلسفہ تھا، اپنی زندگی تھی، اپنا مخصوص ماحول، اپنی مصروفیتیں۔ اور زندگی بڑے سکون اور اطمینان سے گزر رہی تھی۔ ہم گھنٹوں ٹینس کھیلتے، کالج کے سوئمنگ پول میں تیرتے، کالج کے ڈراموں اور رقصوں کی مشق اور ریڈیو پروگراموں کی رسی ہرسل کرتے۔ scandal mongering کی جاتی۔ رات کو باہاجان کے ساتھ میں دیر تک اقبال کی شاعری اور دنیا جہان کی باتوں پر بحث کرتی رہتی۔ ابا جان میرے بہترین دوست تھے۔

— لیکن ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے اور کملا کو اپنا confusionism

کا سارا فلسفہ بھول جانا پڑا۔ زندگی کے متعلق ہمارے اصول اور نظریے بالکل غلط اور بیکار ثابت ہوئے۔ ہم نے تجزیہ نفس کے سارے تجربے پڑھ ڈالے پر کچھ فائدہ نہ ہوا۔

— کیونکہ نیلوفر کی نیلی آنکھوں میں آنسو جھلکا اٹھے۔ کس قدر چنہ ہو، میں نے

انتہائی بیزاری کے ساتھ کہنا چاہا۔ محبت — محبت جو ابلیس کی طرح جنت سے جہنم میں پھینک دی جاتی ہے۔ اور دھند لکوں میں بھٹکے ہوئے وہ احمق راہی، جو سایوں کے پیچھے بھاگتے ہیں اور یہ بھی نہیں جانتے کہ ان کے دیوتاؤں کے پیرمٹی کے ہیں۔ میں نے سوچا کہ ان الفاظ کے ذریعے نیلوفر کے سر میں عقل واپس آجائے گی لیکن اس کی آنکھوں میں پانی اسی طرح چمکتا رہا۔

— اور اسی دقت فون کی گھنٹی تھرا اٹھی۔ مسعود بھیا کو علیحدہ کوٹھی مل گئی تھی

اور وہ ہمارے یہاں سے جا چکے تھے لیکن مس عثمانی برابر فون کیے چلی جا رہی تھیں۔ یا اللہ لوگ اس قدر گدھے، آٹو کیوں ہیں؟

آج پہلی مرتبہ مس عثمانی سے میرا سابقہ پڑا۔ ادھر سے آواز آئی: ”لو! آپ کہاں

سے بول رہی ہیں۔“ ”جی میں یلدرم کے گھر سے بول رہی ہوں۔ ۲۱۔ فیض آباد روڈ۔

فرمائیے۔ ”ار۔۔ مسعود امام صاحب ہیں؟“

غصے کے مارے جی چاہ رہا تھا کہ بس زبیدہ عثمانیٰ مرحبا میں یا میں مرحاؤں اسی وقت ادھر سے پھر آواز آئی : ”اور آپ یلدرم صاحب کی صاحبزادی ہیں؟“ جی اس خاکسار کو آپ سے فون پر نیاز حاصل کر کے بے حد قلبی مسرت ہوئی۔ ”میں نے انتہائی مری ہوئی آواز میں کہا۔

”آپ ان بلا تعجب برن کالج میں پڑھتی ہیں نا؟“

”جی۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہی ہی ہی — تجھے تو آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق ہے۔ آپ کو تو میں کہیں دیکھ بھی چکی ہوں اور آپ کی آواز بھی ہے حد ماؤں سی معلوم ہو رہی ہے۔ ریڈیو پر تو اکثر آپ کی آواز سنتی ہوں۔ بے حد سوٹے آواز ہے آپ کی۔“

”جی۔“ میں نے ان کی رائے سے اتفاق کیا لیکن ان کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی

تھی۔ ”ار۔۔ وہ آپ کے بھائی — یعنی کہ وہ اس وقت گھر پر موجود ہیں؟“

”جی نہیں۔“ میں نے فون بند کرنا چاہا لیکن وہ پھر بولیں :

”کہاں گئے ہیں؟ دلکش کلب تو نہیں؟ اور ہو تو ضرور اودھ جیم خانہ گئے ہوں

گے۔ آج وہاں غوث کا سیمی فائنل ہے یا چھتر منزل کلب — انڈیا کافی ہاؤس تو آج نہ گئے ہوں گے۔“

”جی۔“ میں نے جل جھن کر جواب دیا، ”میں کیا بتاؤں، آپ کو خود ہی

معلوم ہے کہ انہیں کہاں کہاں پایا جا سکتا ہے۔“

”جی۔۔ جی ہاں۔۔“

”واقعہ یہ ہے مس عثمانی —“ میں نے کھنکار کر کہنا شروع کیا، کہ مسعود

صاحب کو کو توالی لے جایا گیا ہے۔“

”ایں!“

”جی ہاں۔ دراصل ان کے پیچھے وارنٹ نکلا ہے کیونکہ وہ الہ آباد سے کلکٹر کے یہاں کے چاندی کے چمچے چرا کر بھاگے ہیں اور یہاں بھیس بدل کر گھوم رہے ہیں۔ وہ جو اسٹنٹ جیسٹریٹ وغیرہ کچھ نہیں ہیں بلکہ فیض آباد میں جوتوں کی دکان کرتے ہیں۔ اور مس عثمانی بات یہ ہے کہ —“

دوسرے صبر سے پرکھٹ سے ریسپورڈ رکھ دیا گیا۔

مجھے ساری دنیا پر غصہ آ رہا تھا۔ نیلو فرادر زبیدہ عثمانی اور وہ سب کے سب کم بخت جن کی عقلیں خراب ہو گئی ہیں۔ میں نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی جگمگاتی جاگتی بیوقوف دنیا کو دیکھا۔ سامنے درختوں کے اندھیرے کے پار کلچ کے اونچے اونچے مرمیں ایوانوں میں کورس کیرل لگائے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر شور مچاتی ہوئی لمبی لمبی چمکیلی موٹر میں بھاگ رہی تھیں۔ ندی کے اس پار کافی ماؤں کی فضا میں دھبہ رہی تھیں اور نیلو فرادر اپنے ہوسٹل کے ڈرائنگ روم میں بیٹا نو بجا رہی تھی۔

لیکن پھر دنیا کی حماقتوں اور کمزوریوں پر غصہ آنے کی بجائے مجھے ان بیوقوفوں سے ہمدردی سی ہو گئی اور میں نے سوچا کیوں نہ ان چیزوں کو فرار خدلی سے دیکھا جائے کیونکہ سوٹنگ پول کے اسکیٹل کلب میں ایک روز یہ انکشاف ہوا کہ سر جسٹن کی جو نارنجی بالوں والی لڑکی اور بیٹو کا نوٹ میں پڑھتی ہے معصوم بھائی سے کورس میں اس کی شادی ہو رہی ہے۔

— خداؤں کے یہ چھوٹے چھوٹے معصوم بچے رقصاں ساعتوں کے ساتھ ساتھ ناچتے ہوئے کھلے سبزہ زاروں میں نکل گئے لیکن جب وہ ستارہ سحر کی کلیاں جمع کر کے واپس آئے تو انہوں نے جنگل کے دیوتاؤں کو ویاں نہ پایا۔

ریڈیو پر رقص کے نئے ریکارڈ بچ رہے تھے اور بھائی جان نے، جو اس وقت موڈ میں تھے، کہا: ”آؤ بی بی تمہیں نئے steps سکھائیں۔“ ہم حسبِ معمول برآمدے کے فرش پر رقص کرنے لگے۔ ”اوجھ، ٹھیک سے قدم رکھو۔“ بھائی جان نے ڈانٹا۔ وہ سکھاتے سکھاتے تھک گئے لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ پھر ایک دم سے انہیں کچھ یاد آگیا۔ ”تمہاری دوست کارومان کیسا چل رہا ہے؟“ ہاں، اس پر خیال آیا، ابھی جب میں دفتر سے آرہا تھا تو مسعود سر جسٹس کی پیکارڈ میں لاپلازہ کی طرف جاتا نظر آیا تھا۔ ”میرا دل ڈوب سا گیا اور بھائی جان کہہ رہے تھے: ”بے ایمان کہیں کا۔ فلرٹ ہے بالکل۔ ارے کل اتوار ہے۔ مجھے میگزین سلیکشن کی تیاری کرنی ہے۔“ اور وہ برآمدے کے فرش پر سے کود کر برساتی میں رکھی ہوئی سائیکل پر بیٹھ اور بچھاٹک سے باہر نکل گئے۔ میں انہیں سرو کے درختوں کے پیچھے اوجھل ہوتا ہوا دیکھتی رہی اور تجھے یاد آیا: پانیر کی عظیم الشان امرکین وضع کی عمارت کے نیچے برساتی میں ہم نے پہلی مرتبہ مسعود بھائی کو دیکھا تھا جو اسٹیشن سے سیدھے بھائی جان کے پاس آگئے تھے اور ویاں سے ہمارے ساتھ گھر آئے تھے۔ اور خاؤں نے چپکے سے نیلو فرسے کہا تھا: یہ وہی ہے، یہ وہی ہے جس کے لیے زندگی منتظر تھی! — اور نیلو فرسو جیتی رہی۔ شہد کے جنگلوں کا دیوتا شفقت ناراؤں میں شاید اب بھی موجود ہے۔ ابدی اور مرا ہوا۔ میرے اللہ کس قدر شاعری کی حد تک اہمقانہ خیال تھا۔ ایک بہت طویل راستہ ہے۔ اندھیرا اور خاموش اور اس کے کناروں پر دور دور پرستان کے چھوٹے چھوٹے شہر جگمگا رہے ہیں اور اس راستے کے اختتام پر کسی جگہ وہ اس کا منتظر ہوگا۔ لیکن اس کو کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ آگے چلی جائے گی اور اس کے خواب پیچھے پڑے رہ جائیں گے۔ اور ڈورس فون پر کہہ رہی تھی: ”اینی، نیلو فر کی

پتنگ کٹ گئی۔ ”بھئی خدا کے لیے چپ رہو۔“ میں نے انتہا سے زیادہ اکتا کر کہا۔ وہ بولتی رہی: ”نکھت رحمن کی شادی ۲۳ دسمبر کو ہو رہی ہے۔ بتاؤ کیا پہنیں گے؟ میں تو روپیے لٹو کی ساڑھی پہنوں گی اور کلاسٹریخ مدرسی ساڑھی پہن رہی ہے۔“ اور پھر ہم دیر تک کپڑوں اور زیوروں کے متعلق طے کرتے رہے۔

— نیلو فریڈمان کے پردوں پر زور سے انگلیاں پٹخ کر کھڑی ہو گئی۔ فوہ، تم یہی کہو گی نا کہ کیا حماقت ہے؟ تمہارا یہ فلسفہ کہ دنیا کی ہر بات حماقت ہے، سب سے زیادہ عقل مند پس آپ ہی ہیں۔ میں تھک گئی ہوں اس فلسفے سے تمہارے۔ یہ تو رہی — میں نے کہا۔ ایک بزرگوار کا، جنہیں آپ نے کہیں بچپن میں دیکھا تھا، اپنے خیالوں میں آپ نے ایک انتہائی رومینٹک کردار بنا لیا اور اب ان کی شادی آپ سے نہیں بلکہ کسی اور لڑکی سے ہو رہی ہے، یعنی ایک بہت ہی میٹر آف فیکٹ واقعہ۔

— لیکن ریڈیو گرام پر وہ پرانا نغمہ بجتا رہا: میں نے خواب میں دیکھا کہ میں مریں والاؤں میں رہتی ہوں — اور میں نے محسوس کیا کہ میں واقعی تھک گئی ہوں۔ اسے کس طرح ایتھن دلاؤں کہ یہ سب کچھ سچ سچ کی حماقت ہے۔ وہ کیوں نہیں دیکھتی کہ ہم سب اپنے آپ سے کس قدر مطمئن اور خوش ہیں۔

اس کے چاروں طرف پھیلی ہوئی دنیا، جو خواب نہیں دیکھتی، کیسی پرمکون اور قانع ہے۔ سوتے ہوئے بوڑھے، روتے ہوئے بچے، بارش کے بعد کا آسمان، موسم خزاں کے دیران راستے، درتپچے کے نیچے بکھرے ہوئے نرد اور سرخ پتے، سرما کی راتوں میں آتش دان کے پاس قہوے کی دل نواز بھاپ اور دوستوں کے قہقہے۔ مگر نیلو فریڈمان سمجھ سکی — اور ریڈیو گرام چیخا رہا۔

— پھر تجھے ریو پریٹ بروک کی ایک نظم یاد آئی۔ خداؤں سے انتقام

لینے کے لیے وہ اُن کے آتشیں تخت کے قریب گیا لیکن وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ جنت کے سارے ایوان خالی پڑے ہیں اور فضاؤں میں صرف ایک آواز بازگشت کی گونج تیر رہی تھی۔ اور بارگاہِ خداوندی میں گھاس اُگ اُئی تھی اور خالی تخت کے چاروں طرف ہوا کا ایک بھولا بھٹکا جھونکا کاہلی سے منڈلا رہا تھا جس سے ایوانوں کے پردے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اور ہوا کے اس جھونکے نے سرے ہوئے خداؤں کی خاکستر خلائے بیکراں میں منتشر کر دی تھی۔

— کتنی جلدی یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور جب سرما کی اس جگمگاتی ہوائی شام کے اختتام پر شادی کے ایٹھ ہوم کے بعد ہم لاپلاڑ سے واپس آ رہے تھے تو دفعۃً میں نے محسوس کیا کہ زندگی کے راستوں کی قندیلیں بجھ گئی ہیں اور ستارے دھندلے پڑ گئے ہیں اور وہ واقعی اکیلے رہ گئی ہے اور ہمارے قریب سے بارش کے چیخٹے اڑاتی سررحمن کی پیکار ڈتیزی سے گزر گئی اور ہم نے دیکھا کہ وہ دونوں اپنے نئے گھر، اپنی نئی زندگی کی طرف جا رہے تھے اور کار مال پر بڑھتے ہوئے کپڑے میں کھو گئی اور میں نے خود کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہوئے پھر دعا مانگی کہ کاش وہ سمجھ سکے، کاش وہ سمجھ جائے اور اس نے مڑ کر دیکھا، اس کا خیال تھا کہ محبت گرتی پڑتی اس کے پیچھے بھاگتی آ رہی ہے لیکن وہاں پر صرف ستاروں کا دھندلا تھا اور سرما کی بارش کے ٹھنڈے قطرے تھے اور گہرا آلود برفانی ہوائیں تھیں کیونکہ محبت کب کی مرچکی تھی!

— اور اس نے قہقہہ لگا کر اپنے پرانے انداز میں کہا: ”ٹھیر و پکیو! ڈورس! ایسی، کلا، وملا، مہر جیہیں — میں تم سب کے ساتھ کافی ہاؤس آ رہی ہوں۔“